ISSN 2456-0375

# ماحولیاتی بحران

کا

# فکری مطالعہ

rafeeqemanzil.com
/rafeeqemanzil

جلد: ۳۲ | شمارہ: ۱۰ | اکتوبر ۲۰۱۹ء | محرم/صفر ۱۴۴۱ھ
editor@rafeeqemanzil.com





**MANAGER**
ABDUL JABBAR
managerrmgp@sio-india.org

**Asst MANAGER**
SALEEM AKRAM
asst.managerrmgp@sio-india.org

**₹15** | سالانہ **₹160**

D-300, Abul Fazl Enclave Jamia Nagar, Okhla New Delhi - 110025 | Ph: 8447622919 | Email: officermgp@sio-india.org | www.rafeeqemanzil.com

Printed on behalf of The Students Islamic Organisation ofIndia, Printer & Publisher Tanveer Alam, Printed at Bharat Offset, 2034/35, Qasim Jan Street, Ballimaran, Delhi - 110006, Published from 230, Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi - 110025 | **Editor : Saud Firoz Ahmed**

# صحت مند ماحول صحت مند زندگی

محمد اکمل فلاحی

اللہ تعالی نے کائنات اور کائنات میں موجود تمام چیزوں کو انسانوں کی نفع رسانی کے لیے پیدا کیا ہے۔

یہ صاف ستھری ہوا جس میں وہ سانس لیتا ہے، یہ روح افزاء پانی جس سے وہ اپنی پیاس بجھاتا ہے، یہ ہرے بھرے درخت جن سے وہ پھل، لکڑیاں اور سایہ حاصل کرتا ہے، یہ طرح طرح کے مویشی جن کے دودھ، گوشت اور چمڑے سے وہ فائدہ اٹھاتا ہے، سب کو انسانوں کی خدمت میں لگادیا گیا ہے۔ انسان کی ذمے داری ہے کہ وہ ان تمام چیزوں کی حفاظت کرے اور انہیں ضائع ہونے سے بچائے۔

اس کے لیے ضروری ہے کہ سب مل جل کر اپنے ماحول کی اچھی طرح دیکھ بھال کریں اور اسے بہتر بنائیں۔

ضروری ہے کہ سب مل جل کر اپنے ماحول کو ہر طرح کی آلودگی سے محفوظ رکھنے کی بھرپور کوشش کریں۔

ضروری ہے کہ سب مل جل کر کوشش کریں کہ نقصان دہ چیزیں ان کے ماحول سے قریب نہ آنے پائیں۔

تاکہ ساری چیزیں صحت مند ماحول میں صحت مند رہ سکیں۔

تاکہ سب لوگ صحت اور تندرستی کی دولت سے مالا مال ہوکر زندگی گزار سکیں۔

تاکہ سب لوگ اچھی صحت کے ساتھ اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کرسکیں۔

یاد رکھیں! ماحول کی حفاظت کرنا ہر فرد کا کام ہے اور ہر فرد کی ذمے داری ہے۔

یاد رکھیں! اگر کچھ لوگوں کی وجہ سے ماحولیاتی فضا متاثر ہو رہی ہو تو اس پر خاموشی اختیار کرنے کے بجائے انہیں اس کام سے روکنے کی سنجیدہ کوشش ہونی چاہیے، ورنہ اس کی لپیٹ میں سب آجائیں گے۔

یاد رکھیں! اگر آپ نے اپنے ماحول کو صحت مند ماحول نہیں بنایا یا اسے مضر اثرات سے نہیں بچایا، تو آپ کو صحت مند ہوا، صحت مند غذا اور صاف ستھرا پانی نہیں مل سکے گا۔ آپ کو آلودہ ہوا، آلودہ غذا اور آلودہ پانی ہی ملے گا۔ تب آپ کی اور آپ کے بچوں کی صحت خراب ہوگی، تب آپ اور آپ کے بچوں کو طرح طرح کی بیماریاں لاحق ہوں گی۔ اس طرح آپ اور آپ کے بچے صحت وتندرستی جیسی عظیم نعمت اور صحت مند زندگی سے محروم ہوجائیں گے۔

جب انسان صحت کی دولت سے محروم ہوجاتا ہے تب وہ کسی کام کا نہیں رہتا، تب وہ زندگی سے مایوس ہوجاتا اور جینے کے بجائے موت کی تمنا کرنے لگتا ہے!

آئیں، ہم سب مل جل کر ماحول کے تحفظ کے لیے بہتر سے بہتر تدبیریں اپنائیں۔

آئیں، ہم سب مل جل کر اپنے ماحول کو صحت مند ماحول بنائیں اور صحت مند زندگی گزاریں۔

# ٹکڑے ٹکڑے ہوجائیں گی جب حد سے بڑھیں گی زنجیریں!

حکومت ہند نے سنگ دلی کی انتہا کردی ہے۔ کشمیر سے دفعہ 370 کے خاتمے کو زائد از چالیس روز ہو چکے ہیں۔ کرفیو بدستور لگا ہوا ہے۔ ذرائع موصلات بند ہیں۔ کشمیری عوام کے لیے ایک ایک لمحہ، صدیوں کی طرح گزر رہا ہے۔ یہ شب ظلمت نہ جانے کب تک دراز رہے گی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا خطہ کشمیر روئے زمین سے معاً غائب ہوگیا ہے۔ چٹھی، نہ کوئی سندیش۔ مکمل بلیک آوٹ۔ مودی میڈیا ہر روز صبح سے شام تک یہ ثابت کرنے میں لگا ہوا ہے کہ کشمیر میں حالات بالکل 'نارمل' ہیں۔ لیکن یہ ایک فریب ہے۔ یہ اندازہ تھا پھر بعض عالمی خبر رساں ایجنسیوں کی پورٹنگ سے اس کی تصدیق بھی ہوگئی کہ حالات انتہائی ناگفتہ بہ ہیں۔ معمول کی زندگی کو ناممکن بنانے کا حکومت نے پورا بندوبست کر رکھا ہے۔ 'دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت' نے دفعہ 370 کے حوالے سے اپنے فیصلے میں پہلے تو کشمیری عوام کو شامل نہیں کیا، پھر فیصلے پر اختلاف رائے کا اظہار کرنے والوں پر کریک ڈاون کر رہی ہے۔ متعدد ہلاکتیں بھی ہوئی ہیں۔ وادی کے تمام سر برآوردہ قائدین ہنوز نظر بند ہیں۔

دفعہ 370 کے خاتمے کے فیصلے کو نافذ کرنے کے لیے حکومت ہند نے جبر و تشدد پر مبنی جس آمرانہ راستے کا انتخاب کیا ہے، اسے دیکھ کر توقع کی جارہی تھی کہ اقوام متحدہ، تحفظ حقوق انسانی کے عالمی ادارے اور پوری عالمی برادری یا کم از کم مسلم ممالک اس کی پرزور مخالفت کریں گے اور مودی انتظامیہ کو اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے پر مجبور کریں گے۔ لیکن اس موقع پر عالمی سیاست میں موجود اقدار اور اصولوں کا شدید بحران بہت واضح طور پر سامنے آگیا۔ اعتراف کرنا پڑا کہ رہی سہی حق پرستی و انصاف پسندی بھی اب باقی نہیں رہی۔ مفاد پرستی اور ابن الوقتی کا دور دورہ ہے۔ عالمی برادری تو کجا، خود مسلم ممالک نے اس ضمن میں کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ دکھاوے ہی کے لیے سہی، مذمتی بیانات تک جاری نہیں کیے گئے۔ حکومت ہند پر کوئی عالمی دباؤ نہیں ڈالا گیا۔ کسی کے سفارتی تعلقات متاثر نہیں ہوئے۔ حد تو اس وقت ہوگئی جب کہ عین انھی ایام میں جب کہ وادی میں ظالمانہ کریک ڈاون اور بلیک آوٹ کا کھیل اپنے شباب پر تھا، متحدہ عرب امارات نے وزیر اعظم ہند کو اپنے اعلی ترین شہری ایوارڈ سے نوازا اور اس میں ننگ و عار محسوس نہیں کیا۔ امارات ہو یا وہ ممالک جنھوں نے ہندوستان میں سرمایہ کاری کی ہے، مجبور ہیں کہ کوئی ایسی سرگرمی انجام نہ دیں جو وزیر اعظم ہند کی 'طبع نازک' پر گراں گزرے۔ یہ ممالک نہیں چاہتے کہ محض 'سیاسی مسائل' کی بناء پر اسے ایک سو پچیس کروڑ افراد پر مشتمل 'مارکیٹ' سے ہاتھ دھونا پڑے۔

اس فیصلے کی مخالفت کی جو توقع خود وطن عزیز کے تمام انصاف پسند شہریوں سے تھی، افسوس ہے کہ وہ توقع بھی اک امید خام ہی ثابت ہوئی۔ ملت اسلامیہ ہند، مسلم تحریکوں، جماعتوں اور انجمنوں کا ردعمل بھی بہت زیادہ حوصلہ افزا نہیں معلوم ہوا۔ اس مسئلے پر ملت بہ حیثیت مجموعی خواب غفلت میں مست رہی۔ جن جماعتوں اور ملت کے اجتماعی اداروں سے کچھ امید تھی کہ مختلف طریقے اختیار کر کے حکومت پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کریں گی، ان جماعتوں اور اداروں نے بھی حسب معمول خوبصورت لفظیات سے آراستہ مذمتی بیانات ہی پر اکتفا کیا۔ یہ بدلے ہوئے سیاسی حالات کی کرشمہ سازی ہے کہ مختلف جماعتیں اور انجمنیں سیاسی-سماجی مسائل پر بیانات جاری کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتی ہیں۔ بیانات جاری کرنے کا عمل ایک ناگزیر مجبوری بن چکا ہے۔ اب یہ بھی صاف طور پر محسوس ہونے لگا ہے کہ جو بیانات جاری کیے جاتے ہیں ان میں نفس مسئلہ کے حل پر فوکس نسبتاً کم اور اپنی 'پوزیشن کلیئر' کرنے پر توجہ زیادہ صَرف کی جاتی ہے۔

موجودہ حکومت اپنے ہر 'ماسٹر اسٹروک' پر کمال عیاری سے 'قومی مفاد' اور 'قومی سلامتی' کی ملمع کاری کر کے اسے اس انداز میں پیش کرتی ہے کہ اس کی مخالفت کرنے والا قومی مفادات کا دشمن اور قومی سلامتی کے لیے خطرہ قرار پاتا ہے۔ دفعہ 370 کو ختم کرنے کا معاملہ بھی اسی نوعیت کا ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ حکومتی فیصلوں کی مخالفت میں کسی ایک ملی جماعت کی جانب سے غیر ضروری ردعمل کا اظہار یا اس ضمن میں کوئی سرگرمی یا تحریک، حکمت اور دور اندیشی کے منافی ہو۔ اگر کوئی جماعت اس نوعیت کی کوئی سرگرمی انجام دیتی ہے تو اس کے لیے اس سوال کا جواب دینا مشکل ہوجائے گا کہ ''آپ اِس طرف ہیں؟'' یا ''اُس طرف؟''۔ تاہم یہ عذر خاموش بیٹھ جانے کا جواز نہیں بن سکتا۔ اس کا حل یہ ہے کہ آپ اپنے آرگیومنٹ میں میچورٹی اور ردعمل کے طریقوں میں تبدیلی لائیں۔ مثال کے طور پر کشمیر کے حالیہ مسئلے کے تناظر میں ایک ایسا مضبوط، واضح اور مدلل ڈسکورس کھڑا کریں کہ نہ صرف حکومت، دانشور طبقہ اور میڈیا پر بلکہ پوری دنیا پر واضح ہوجائے کہ ''ہم نہ اِس طرف ہیں، اور نہ اُس طرف۔ ہم دراصل اس طرف ہیں جہاں عدل، انصاف، انسانی حقوق، جمہوریت اور انسانیت ہے اور ہماری جدوجہد اور سرگرمی اسی کے لیے ہے۔''

کشمیر کا مسئلہ نیا نہیں ہے۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ مسئلہ پیچیدہ ہوتا چلا گیا ہے۔ اس میں ہندوستان اور پاکستان دونوں ممالک کی نیتیں صاف نہیں رہی ہیں۔ دونوں ملکوں نے اسے اپنی ناک کا مسئلہ بنالیا ہے۔ ماضی میں مسئلے کو حل کرنے کے کئی مواقع آئے، مذاکرات و معاہدات ہوئے، اقوام متحدہ کی مداخلت بھی ہوئی۔ لیکن دونوں ملکوں کی جانب سے رسم بے وفائی ہی عام رہی۔ پاکستان کا پرچم لہرانے والے، پاکستان کا قومی ترانہ گنگنانے والے، نام نہاد اسلامی جمہوریہ پاکستان پر فدا، پرو-پاکستان کشمیری نوجوان بھی مسئلے کو پیچیدہ بنانے کے ذمہ دار ہیں۔ ملک میں اب جو حکومت برسر اقتدار ہے، کشمیر کی مسلم عوام کے حوالے سے اس کے عزائم خطرناک ہیں۔ یہ حکومت مستقبل میں مزید تشدد کا راستہ اختیار کرنے سے دریغ نہیں کرے گی۔ لیکن حکومت ہند کو معلوم ہونا چاہیے کہ تشدد ہی نے کشمیری نوجوانوں میں باغیانہ تیور پیدا کیے ہیں۔ مزید تشدد سے وہ کبھی کشمیری عوام کو ہندوستان کا حصہ نہیں بنا سکے گی۔ تشدد، بغاوت کو جنم دیتا ہے۔ مسئلہ دائمی طور پر جب بھی حل ہوگا وہ تشدد اور اسلحہ کے ذریعے نہیں بلکہ خلوص، انسانی ہمدردی، مذاکرات، گفت و شنید، افہام و تفہیم اور سہ طرفہ قربانیوں سے ہی حل ہوگا۔ اس حقیقت کو مسئلہ کشمیر کے تمام فریق جتنی جلدی ریالائز کرلیں اتنا بہتر ہے۔

سعود فیروز

نظر

# اسلام، ماحولیات اور ہم

سید احمد مذکر

## تمہید

آج جب ہم اپنے گرد و پیش میں پھیلی ہوئی دنیا کا جائزہ لیتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ہمارے ماحول میں کس قدر آلودگی پیدا ہو چکی ہے۔ ہوا سے لے کر پانی تک، غذا سے لے کر مٹی و زمین تک شاید ہی کوئی چیز ہو جو آلودگی سے محفوظ ہو۔ آلودگی کی وجہ سے آج ایک سنگین ماحولیاتی بحران پیدا ہو چکا ہے۔ یہ بحران اتنا شدید ہے کہ اس نے کرہ ارض کے مستقبل پر ہی سوالیہ نشانات لگا دیے ہیں۔ تاہم حیرت و استعجاب کی بات یہ ہے کہ دنیا کے بیشتر انسان اس ماحولیاتی بحران کی زد میں ہونے کے باوجود اس سے بے خبر و غافل ہیں۔ ہم اس بات سے بے خبر ہیں کہ آئندہ پانچ سالوں میں ہمارے ملک کے اکثر شہروں میں پینے کے پانی کی شدید قلت پیدا ہو جائے گی۔

ماحولیاتی بحران ایک وسیع موضوع ہے۔ اس مضمون میں اس سے متعلق چند بنیادی معلومات سے واقف کرانا اور کچھ عملی اقدامات کی طرف توجہ مبذول کرانا مقصود ہے۔ یہ مضمون تین نکات کا احاطہ کرتا ہے۔ پہلے میں ماحولیاتی بحران کو سمجھنے کی غرض سے فکری و نظریاتی گفتگو کی گئی ہے۔ دوسرے میں ماحولیاتی بحران کے اثرات اور اس کی وسعت کو پیش کیا گیا ہے۔ جب کہ تیسرے نکتے کے ذیل میں ماحولیات کے تحفظ کے حوالے سے اسلامی تعلیمات اور ماحولیاتی بحران سے نبرد آزما ہونے کے لیے ہم یعنی طلبہ و نوجوانوں کے ممکنہ کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

## ماحولیاتی بحران کیا ہے؟

قرآن مجید میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ انسان کو کمزور پیدا کیا گیا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مختلف اعتبارات سے انسان دیگر مخلوقات کی بہ نسبت کمزور ہے۔ انسان لباس کے بغیر سرد و گرم موسموں کی شدت کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ انسانی بچہ اپنی ولادت کے بعد اپنی بنیادی ضروریات کے لیے ایک طویل مدت تک اپنے والدین پر منحصر ہوتا ہے۔ بے شمار درندے ایسے ہیں جن کا مقابلہ کرنے کی انسان جسمانی طاقت و صلاحیت نہیں رکھتا۔ لیکن انسان کی یہ تمام کمزوریاں ایک طرف، دوسری طرف اللہ تعالی نے انسان کو بلا کی عقل سے نوازا ہے۔ یہ عقل ایک ایسی نعمت خداوندی ہے جو انسان کو مذکورہ بالا تمام کمزوریوں کے علی الرغم دیگر تمام مخلوقات پر فوقیت عطا کرتی ہے۔ انسانی عقل ہی انسان کی وہ قوت و صلاحیت ہے جس کی بناء پر وہ دنیا اور اسباب دنیا کو مسخر کر سکتا ہے۔ محض ظاہری اسباب و وسائل ہی نہیں بلکہ انسان اُن اسباب و وسائل کو بھی مسخر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے جو خلا اور فضا میں موجود ہیں، جو سطح زمین پر ظاہر و باہر ہیں، جو زیر زمین پوشیدہ ہیں اور جو سمندر کی گہرائیوں میں موجزن ہیں۔

ماحولیاتی بحران کا صحیح فہم پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ایک نظر انسان اور ماحول کے باہمی ربط اور تعامل کی تاریخ پر بھی ڈال لی جائے۔ اس کے لیے ان نظریات کو سمجھ لینا بھی مفید ہوگا جو ربط اور تعامل کی بنیاد اور محرک رہے ہیں۔

انسان اور ماحول کے باہمی ربط کی تاریخ دلچسپ ہے۔ قدرتی ماحول اور انسان کی تاریخ کافی دلچسپ ہے۔ انسانی تاریخ میں ایک طویل عرصہ ایسا گزرا ہے جس میں انسان غیر مہذب اور غیر متمدن تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انسان خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتا تھا۔ انسان چھوٹے چھوٹے قبیلوں کی شکل میں رہتے تھے۔ ان قبیلوں میں سارے لوگ ایک دوسرے سے نسلی رشتہ رکھتے تھے۔ تعداد کے لحاظ سے یہ قبیلہ کافی چھوٹے ہوتے تھے۔ اس زمانے کا انسان خورد و نوش کے لیے اپنے ماحول پر منحصر اور مربوط ہوتا تھا۔ وہ یا تو شکار کرتا تھا یا پھر پھول پودوں پر منحصر ہوتا تھا۔ انسان کی تاریخ میں شاید یہی وہ دور تھا جس میں انسان کا ماحول اور قدرت سے رشتہ سب سے مضبوط رہا کیوں کہ اس دور میں میں بقا کا انحصار اس بات پر تھا کہ انسان اپنے آپ کو ماحول اور قدرت سے مربوط اور ہم آہنگ کر لے۔ یہی وہ دور تھا جس میں انسان نے قدرت پرستی (Worship of Nature) شروع کی۔ قدرتی طاقتوں اور آفتوں مثلاً بارش، طوفان، موسمیاتی تبدیلیاں، آندھی، سیلاب وغیرہ، اس کے علاوہ مہلک بیماریاں اس غیر متمدن انسان کے لیے حیران کن تھیں۔ ان آفات کے سامنے انسان کی بے بسی نے اس غیر متمدن انسان کے اندر ان کی پرستش کے جذبات پیدا کر دیے۔ یہیں سے مختلف دیومالائی قصے کہانیوں کا وجود ہوا اور دیوی دیوتاؤں کی پرستش کی ابتدا ہوئی۔

اس شکاری دور میں انسان کی تخلیقی صلاحیتیں اسی قدر پروان چڑھ سکی تھیں کہ وہ بہت ہی بنیادی قسم کے آلات اور ہتھیار بنا سکے۔ یہ حالات اور ہتھیار بہت معمولی تھے اور پتھر کو تراش کر بنائے جاتے تھے۔ انسان کی غذا کا انحصار اتفاق پر ہوتا تھا۔ اتفاقاً کوئی جڑی بوٹی، پیڑ پودا یا پھل وغیرہ مل جاتا تو انسان اسے اپنی غذا کے طور پر استعمال کر لیتا اور اگر ایسی کوئی شے نہ ملتی تو اسے فاقہ کرنا پڑتا۔ لیکن اس شکاری دور کے بعد رفتہ رفتہ مختلف تجربات و اتفاقات سے گزرتے ہوئے انسان نے اس حقیقت کو دریافت کر لیا کہ مختلف پیڑ پودوں کے بیجوں کو اگر فلاں موسم میں اور فلاں قسم کی زمین میں بو دیا جائے اور ان کی آبیاری کی جائے تو وہ اگنے لگتے ہیں۔ پھر انسان اس بات کا محتاج نہیں رہتا کہ اگر کوئی پیڑ پودا اتفاقاً مل جائے تبھی وہ اپنا پیٹ بھر سکے ورنہ بھوکا رہے اور فاقہ کرے۔ اس غیر معمولی دریافت نے اس وقت کے انسان کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔

اب انسان خانہ بدوشی کی زندگی سے ایک جست لگا کر متمدن دنیا کی طرف گامزن ہو چکا تھا۔ انسانی زندگی میں یہ تبدیلی بھی آئی کہ اپنے گزر اوقات کے لیے وہ صرف جانوروں کے شکار کرنے اور جڑی بوٹیوں کو جمع کرنے پر منحصر نہ رہا بلکہ اس نے کاشت کاری شروع کر دی۔ کاشت کاری کے آغاز کے بعد انسانی آبادیاں مختلف ندی، نالوں اور آبی ذخائر کے آس پاس آباد ہونا شروع ہو گئیں۔ آلات کی صنعت میں بھی تبدیلی آنے لگی۔ پتھر کے آلات کاشت کاری کے لیے موزوں نہیں تھے اس لئے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مختلف دھاتوں سے بنے آلات بھی ایجاد ہونے لگے۔ یہ آلات پتھر کے آلات کے مقابلے میں زیادہ پائیدار تھے۔ متمدن زندگی کے تقاضوں کے پیش نظر انسانی زندگی کو منظم اور منضبط کرنے کی کوششیں شروع ہو گئیں۔ باہمی معاملات طے کرنے اور تنازعات کو حل کرنے کے لیے مختلف ضابطے اور اصول وضع کیے گئے۔

اب تک انسان نے ماحول سے محض استفادہ کیا تھا، ماحول میں کوئی دخل اندازی نہیں کی تھی۔ لیکن مہذب اور متمدن زندگی کے آغاز کے بعد اور کاشت کاری کے پیشے سے منسلک ہونے کے بعد انسان نے قدرتی ماحول میں دخل اندازی شروع کر دی۔ وہ قدرتی وسائل اور قدرتی عمل میں بھی خلل انداز ہونے لگا۔ اگر چہ کہ دخل اندازی کا یہ عمل اسی صلاحیتِ تسخیر سے عبارت تھا جو اسے خود اللہ تعالی نے عطا کی تھی تاہم اس صلاحیت کے بڑے دور رس اور منفی اثرات سامنے آنے لگے۔

اس دوران انسان کا تمدنی سفر بھی مختلف ادوار اور مراحل سے گزرا۔ متمدن طرز زندگی کو اختیار کرنے کے نتیجے میں انسان آبادیوں کی شکل میں بسنے لگے۔ یہ خانہ بدوش طرز زندگی سے زیادہ محفوظ طرز زندگی تھا۔ ماضی میں آبادیاں ایک ہی نسل کے قبیلے پر مشتمل ہوتی تھیں۔ پھر جب یہ قبیلے بڑھنے لگے تو آبادیاں بھی بڑھنے لگیں۔ تمدنی اور صنعتی ضروریات کے پیش نظر انسانوں کے مابین تقسیم کار (Division of Labour) عمل میں آیا۔ اس طرح ایک ہی نسل سے تعلق رکھنے والے انسان مختلف خطۂ ارض میں پھیلنے لگے۔ عموماً ان کا نسب، زبان اور ثقافت مشترک ہی ہوا کرتی تھی۔ مسلسل بڑھتی ہوئی انسانی آبادی کے نتیجے میں مختلف نسلی، لسانی اور تہذیبی شناختوں کے حامل انسان آپس میں خلط ملط ہونے لگے۔ اس کے نتیجے میں ایک متنوع انسانی سماج وجود پذیر ہونے لگا۔ ارتقاء پذیر تمدنی تقاضوں کے سبب سیاسی، سماجی اور اقتصادی شعبوں میں بھی تنوع اور ارتقاء ہونے لگا۔ مختلف طرز ہائے حکومت، سماجی رسوم و رواج، اقتصادی اصول و ضوابط وغیرہ وجود میں آتے گئے۔ تقریباً پانچ صدی پہلے انسانی تاریخ میں وہ انقلاب برپا ہوا جسے صنعتی انقلاب (Industrial Revolution) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ صنعتی انقلاب کے بعد علوم و فنون اور ٹکنالوجی میں جو

انفجار (Explosion) رونما ہوا اس نے بہت کم عرصے میں دنیا کا رخ بدل دیا۔ صنعتی انقلاب کے جو بھیانک منفی اثرات ماحولیات پر پڑے ہیں، اس کی تاریخِ عالم میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ ان اثرات کو سمجھنے کے لیے مناسب ہوگا کہ پہلے صنعتی انقلاب کی پشت پر موجود فکر و نظریہ کو بھی سمجھ لیا جائے۔

صنعتی انقلاب کی ابتدا یورپ سے ہوئی۔ اس کے پیچھے استشراق (Enlightenment) کا نظریہ موجود تھا۔ یہ دراصل ایک علمی اور نظریاتی انقلاب تھا۔ اس انقلاب نے تحویلِ شاکلہ (Paradigm Shift) برپا کر دیا۔ یہ ایک انوکھا اور تاریخی طور پر بے نظیر تغیر تھا۔ اس کی بنیاد پر محض علوم وفنون ہی نہیں بلکہ نظریہ حیات (World View) میں بھی بنیادی نوعیت کی تبدیلیاں واقع ہوگئیں۔ اس انقلاب کو سمجھنے کے لیے بھی استشراق کے وقت یورپ میں رائج سماجی، سیاسی اور اقتصادی عوامل کو سمجھنا ضروری ہے۔ سماجی طور پر یورپ ایک طویل مدت تک عیسائی پاپائیت کے زیر سایہ تھا۔ پاپائیت نے یورپ کے مختلف شاہی خانوادوں سے اپنے آپ کو اس طرح وابستہ رکھا تھا کہ سیاسی اقتدار تو شہنشاہوں کے ہاتھوں میں رہا اور مذہبی اجارہ داری پادریوں کے پاس۔ اقتصادی اعتبار سے یہ شہنشاہیت جاگیردارانہ نظام پر قائم تھی۔ عوام جو مذہبی تھی، کلیسا کے زیر اثر تھی۔ کلیسا نے اپنے مفادات کے حصول کے لیے اپنے آپ کو شہنشاہیت سے وابستہ کر لیا۔ اب شہنشاہیت اپنے تسلط کی بقا کے لئے جو بھی کرے اسے کلیسا کی تائید حاصل ہوتی تھی۔

مزید یہ کہ جاگیردارانہ نظام نے جاگیرداروں کو بااختیار بنا دیا اور عوام کو ان کے آگے بالکل بے بس کر کے رکھ دیا۔ مجموعی طور پر اس ظالمانہ گٹھ جوڑ کا نتیجہ یہ نکلا کہ عوام کی حیثیت مویشی کی طرح ہوگئی۔ جاگیرداران کا بھرپور استحصال کرتے تھے۔ دادرسی کے لیے وہ بادشاہوں کے پاس بھی نہیں جا سکتے تھے کیوں کہ بادشاہوں کے مفاد خود جاگیرداروں سے وابستہ تھے۔ چاہے وہ باج کی شکل میں بادشاہوں کی خود اپنی دولت ہو جو وہ جاگیرداروں سے وصول کرتے تھے یا پھر فوج اور اسلحہ کی شکل میں جسے بوقت جنگ جاگیردار بادشاہوں کے لئے مہیا کرتے تھے۔ اس صورتحال میں صرف ایک کلیسا کا باقی رہ گیا تھا جسے عوام انصاف کے حصول کے لیے کھٹکھٹا سکتے تھے۔ لیکن کلیسا کا کردار بھی کافی مایوس کن رہا۔ چوں کہ بادشاہ سے ان کی ساز باز تھی جس کی بناء پر کلیسا شہنشاہوں کی حکومتوں کا منجانب خدا ہونا ٹھہراتا تھا اور اس کے عوض بادشاہوں کی طرف سے کلیسا کو جاگیریں اور دعوت وتبلیغ اور مذہبی پیشوائی کی کھلی چھوٹ ملتی تھی۔ کلیسا نے شہنشاہیت کے تئیں جو رویہ اختیار کیا اور اس کے جواز اور بقا کے لئے مذہب کو استعمال کرتے ہوئے جو پٹی پڑھائی وہ تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے۔ علاوہ ازیں خود عیسائیت کے اندر جو انحرافات در آ گئے تھے مثلاً دنیا بے زاری، فطرت کشی، علم دشمنی وغیرہ اس نے لوگوں کے اندر رفتہ رفتہ ایک گہری نفرت پیدا کرنی شروع کر دی۔ علم وتعلیم کا رجحان تو ویسے ہی نہیں تھا لیکن کلیسا نے اس نظام کے تسلط کی بقا کے لیے علم دشمنی کا جو رویہ اختیار کیا اس سے بہت ہی سنگین تاریخی اثرات مرتب ہوئے۔

قسطنطنیہ عیسائی مذہب کا ایک اہم دینی اور علمی مرکز تھا۔ 1453ء میں فتح قسطنطنیہ کے بعد عیسائی علماء نے یورپ کی جانب ہجرت کی اور اپنے ساتھ اپنا علمی ذخیرہ بھی لے آئے۔ ساتھ ہی اہل یورپ کا ایک طبقہ ایسا بھی تھا جس نے ہسپانیہ کی مسلم جامعات سے تعلیم حاصل کی تھی اور اس کے ان پر بہت گہرے اثرات پڑے تھے۔ اسلامی تعلیمات میں نہ دنیا بے زاری تھی، نہ فطرت کشی اور نہ علم دشمنی بلکہ مسلمانوں میں علمی رجحان اور زندگی کے تئیں ایک مثبت رویہ پایا جاتا تھا۔ یہ یورپ کے نوجوان طلبہ کے لیے ایک انوکھا تصور اور شاندار تجربہ تھا۔ ان افکارات سے متعارف ہونے اور ان کے تئیں مسلم معاشروں میں دوران تعلیم زندگی بسر کرنے کی وجہ سے یورپی نوجوانوں کی ذہنیت اور خیالات تبدیل ہونے شروع کر ہو گئے۔ ان دونوں تاریخی واقعات نے خود یورپ کا اور پھر دنیا کا مستقبل بدل دیا۔ علمائے قسطنطنیہ اور ہسپانوی جامعات سے تعلیم یافتہ طلبہ کی یورپ آمد اس سامراجی نظام زندگی کے لیے چیلنج تھا۔ اس نظام پر سوالات ہونے لگے۔ اس کے خلاف علمی دلائل پیش کیے جانے لگے۔ ان تنقیدوں کا براہ راست ہدف کلیسا بنا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اصل حکمرانی تو کلیسا ہی کی تھی کیوں کی لوگ اسی کے نظریہ حیات کی پیروی کرتے تھے اور اسی کو تشریعی قوت کے طور پر مانتے تھے جسے کلیسا پیش کرتا تھا۔ خود شہنشاہیت کو بھی کلیسا ہی سے تائید حاصل ہوتی تھی۔

یورپ میں تبدیلی اور بیداری کی اسی لہر کو استشراق کہتے ہیں۔

طویل جدوجہد کے بعد بالآخر استشراق روایت کے خلاف کامیاب ہوگئی۔ شہنشاہیت نے گھٹنے ٹیک دیے اور حکومت اور سیاست میں عوام کی شمولیت کو تسلیم کر لیا گیا۔ اس سے پہلے عالم یہ تھا کہ لوگوں کے حقوق تو کجا ان کو بااختیار اور باعزت انسان بھی نہیں مانا جاتا تھا۔ عوام بادشاہ کی رعیت (subjects) تھے۔ بادشاہ جس کے ساتھ جو چاہے سلوک کر سکتا تھا۔ چوں کہ کوئی دستور نہ تھا اور بادشاہ کے الفاظ ہی قانون ہوتے تھے تو عوام کی حیثیت بھی ایک ریوڑ سے زیادہ کی نہیں تھی۔ لیکن استشراق کے بعد جو انقلاب برپا ہوا اس میں وہ مشہور زمانہ طرز حکومت وجود میں آیا جسے ہم آج جمہوریت کے نام سے جانتے ہیں۔ اس سے جو تحویل شاکلہ (Paradigm Shift) ہوئی اس کے نمایاں نکات ذیل میں پیش کئے جا رہے ہیں:

1) عوام محکوم رعیت سے آزاد شہری بن گئے۔ جس میں سب یکساں اور

مساوی درجہ رکھتے تھے۔ نہ کوئی بادشاہ تھا نہ کوئی اشرافیہ یا جاگیردار جو ماضی میں عوام سے الگ اور بہتر درجہ رکھتے تھے۔

2) قومی ریاستیں (Nation States) وجود میں آئیں۔ جن کی بنیاد شہریوں پر تھی نہ کہ کسی بادشاہ یا شاہی خاندان کی ملکیت پر۔ ریاست شہریوں کی باہمی رضامندی اور معاہدے کے نتیجے میں وجود میں آتی تھی نہ کہ بادشاہ کی ملکیت کے طور پر۔

3) حکومت پر کسی خاندان یا طبقے کی اجارہ داری کے بجائے عوام کا حق تسلیم کیا گیا اور حکومت عوام یا ان کے منتخب کردہ نمائندوں کے ذریعے وجود میں آنے لگی۔

4) اقتصادی میدان میں جاگیرداری ختم ہوئی اور اب سب کو اقتصادی عمل میں یکساں مواقع اور آزادانہ طور پر شرکت کرنے کا موقع ملنے لگا۔

جہاں تک سماجی دائرہ اور بالخصوص مذہب کا تعلق تھا، معاملہ سب سے زیادہ یہاں بگڑا۔ چوں کہ کلیسا نے استشراق کی مخالفت کی اور سامراجیت کے حق میں مذہب کو استعمال کیا اور عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ استشراق کے جو بھی لوازمات اور اقدار ہیں وہ خدا اور فطرت کے خلاف ہیں اور استشراقی روایت سے وابستگی گویا کہ خدا کو چیلنج کرنا ہے۔ اس طرح عقل انسانی کو خدا کے مقابل اور خلاف لا کھڑا کیا گیا۔ استشراقی اقدار مثلاً حریت، اخوت، مساوات اور علم دوستی وغیرہ کو صفاتِ خبیثہ تصور کیا گیا اور استشراق کو شیطانی تحریک قرار دیا گیا۔ جب تک کلیسا با اختیار رہا تب تک اس نے استشراق کے خلاف پوری قوت لگائی۔ استشراقی مفکرین کو نذر زنداں کیا گیا، اذیتیں دی گئیں اور عبرت ناک سزائیں سنائی گئیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام کے اندر بالعموم اور مفکرین کے اندر بالخصوص عیسائیت کے خلاف نہایت شدید نفرت پیدا ہو گئی اور یہ نفرت بڑھتے بڑھتے نفس مذہب تک پہنچ گئی۔ پھر تو استشراقی روایات نے مذہب ہی کی نفی کرنا شروع کر دیا۔ نتیجے کے طور پر ایک ایسا نظریہ حیات وجود میں آیا جو نہ صرف یہ کہ مذہب بے زار تھا بلکہ تصور خدا ہی کا منکر تھا۔ پھر اس کی کوکھ سے جنم لینے والے مختلف افکار و نظریات پہلے یورپ پر اور پھر نو آبادیاتی (Colonial) قوتوں کے ذریعے دنیا بھر میں چھا گئے۔

دور حاضر کا پورا نظام زندگی بھی اسی نظریہ حیات پر مبنی ہے۔ چاہے علمی، فکری، اخلاقی، سماجی اور سیاسی کوئی بھی شعبہ ہو ہر شعبے کی بنیاد اسی نظریہ پر مبنی ہے۔ اسی کے نتیجے میں وہ سب کچھ ہوا ہے جو صنعتی انقلاب کے بعد سے گزشتہ کئی صدیوں سے چلا آ رہا ہے اور جس کے خطرناک اور مہلک نتائج آج تک دنیا بھگت رہی ہے۔

اس مقالے کی اس قدر طویل تمہید باندھی گئی ہے کہ قاری ضرور حیران ہو گا کہ موضوع میں اور مضمون میں کافی فرق ہے۔ لیکن یہ اس لیے ضروری تھا کہ اس کی بنیاد سمجھے بغیر حقیقت نفس الامری تک رسائی اور اس کا صحیح ادراک ممکن نہیں تھا۔ یہ نظریہ حیات ہے کیا اور اس سے پیدا ہونے والے افکار و نظریات نے کس طرح وہ اثرات مرتب کیے ہیں جس سے دنیا پریشان ہے۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ خدا بے زاری کے نتیجے میں نظریہ حیات میں جو تحویل شاکلہ (Paradigm Shift) عمل میں آئی تھی، اس کی چند اہم خصوصیات حسب ذیل تھیں:

1) خدا اور مذہب کی کوئی معروضی حقیقت نہیں ہے۔ یہ دونوں غیر متمدن انسان کے تحفظات اور لاعلمی کی پیداوار ہیں۔ کائنات میں معروضی حقیقت صرف ان ہی چیزوں کو حاصل ہے جو حواس خمسہ سے اخذ کی جا سکتی ہیں اور عقلی طور سے ان کا وجود ثابت کیا جا سکتا ہے۔

2) انسان تمام جانوروں میں امتیازی خصوصیت رکھتا ہے۔ یہ امتیازی مقام اسے اپنی عقل و دانش کی بنیاد پر حاصل ہے۔ چنانچہ سب سے اہم ترین چیز عقل ہی ہے۔

3) چوں کہ نہ کوئی خدا ہے اور نہ کوئی مذہب اس لئے تمام مذہبی عقائد فرضی اور انسان کے تخیل کی پیداوار ہیں۔ حقیقت صرف مادی چیزوں کو حاصل ہے۔

4) اس مادی دنیا میں انسانی زندگی کی اہمیت صرف اس وقت تک ہے جب تک کہ وہ زندہ ہے۔ نہ پیدائش سے پہلے کچھ ہے اور نہ مرنے کے بعد۔ اس لئے انسان کے لیے سب سے اعلیٰ قدر اس کی اپنی حسی تسکین ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی حسی تسکین کے حصول کے لیے زیادہ سے زیادہ کوشش کرے۔ اس مقصد سے کیا جانے والا ہر عمل جائز ہے۔ چوں کہ انسان سب سے زیادہ باشعور مخلوق ہے اس لئے اس کی تسکین سب سے اہم اور مرکزی حیثیت کی حامل ہے۔ اسی نظریہ حیات کا نام ہیومنزم یا سیکولر ہیومنزم قرار پایا۔ سیکولر ہیومنزم کے اثرات افکار و نظریات سے لے کر علوم و فنون اور دیگر تمام شعبہ ہائے زندگی پر پڑے۔

یہاں بہت ہی اختصار کے ساتھ اس کے اثرات کو نکات کی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے:

1) نظریہ حیات میں تبدیلی: اب فرد اور معاشرے نے خدا پر مرتکز تصور کائنات سے ہٹ کر انسان اور انسان کی حسی تسکین پر مرتکز نظام حیات کو اپنا لیا۔

2) خدا کا انکار اور اسی مناسبت سے مذہب اور وحی کے انکار کے نتیجے میں سماج میں مادیت کو غلبہ حاصل ہوتا چلا گیا۔

3) اب صرف حواس خمسہ یا عقل ہی علوم وفنون یا علم المعرفہ (Epistemology) کی بنیاد قرار پائے۔اس کے نتیجے میں تجربیت اور وضعیت کا غلبہ تمام علوم وفنون پر ہو گیا۔اب محض وہی علوم وفنون قابل اعتناء رہے جو تجربی اور وضعی طور پر ثابت ہوتے ہوں اور ان میں بھی چیزوں کو جانچنے کا زاویہ ان ہی تک محدود رکھا گیا ہو۔

4) علم الاخلاق کی بنیاد مذہب سے ہٹا کر سیکولر ہیومنزم پر رکھی گئی اور حسی تسکین قدر اعلیٰ قرار پائی۔

5) سماجی طور پر انفرادی سطح پر بھی اور اجتماعی سطح پر خود مختاری کے تصور نے جڑ پکڑا۔سماج میں رائج طبقاتی فرق وتفاوت کو ختم کیا گیا۔اسی طرح سب کے لئے حریت، اخوت اور مساوات کی قدروں کو یکساں طور پر تسلیم کیا گیا۔یہیں سے لبرلزم کی شروعات ہوئی۔

6) اقتصادی طور پر خود مختاری کے تصور نے اول تو زمینداری کا خاتمہ کیا پھر بلا تفریق سب کے لیے حق ملکیت کو تسلیم کیا گیا۔ساتھ ہی سب کے لیے اقتصادی عمل کی آزادی کو بھی تسلیم کیا گیا۔جب کہ اس سے پہلے لوگ پیشوں کے اعتبار سے مختلف طبقات میں منقسم تھے اور پیشہ بدلنے یا اقتصادی عمل کی آزادی انہیں حاصل نہیں تھی۔یہیں سے سرمایہ داریت کی شروعات بھی ہوئی۔

7) سیاسی سطح پر عوام جو اس سے پہلے محکوم رعیت سمجھے جاتے تھے، اب آزاد اور برابر کا درجہ رکھنے والے شہری بن گئے۔حکومت کسی فرد واحد یا خاندان یا طبقے کی بجائے شہریوں کا اجتماعی حق تسلیم کر لیا گیا۔جمہوری طرز حکومت کو اختیار کیا گیا۔

## صنعتی انقلاب کے اثرات اور ماحول

علوم وفنون تجربی اور وضعی بنیادوں پر ترقی کرنے لگے۔کسی بھی علم یا فن پر کوئی قید نہیں رہی۔اس نے علوم وفنون کا شرح نمو اضافی انداز میں بڑھا دیا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ٹیکنالوجی جو پہلے کئی ہزار سال میں تبدیل ہوتی تھی، اب محض دہائیوں بلکہ چند سالوں میں تبدیل ہونے لگی۔ٹیکنالوجی کے اس انفجار (Explosion) نے صنعت وحرفت، آمدورفت اور ذرائع ابلاغ میں کرشماتی تبدیلیاں پیدا کر دیں۔ٹیکنالوجی نے بڑے پیمانے پر پیداوار کو ممکن بنا دیا۔اس سے صنعت کاری (Industrialization) وجود میں آئی۔پہلے جو افراد پشتینی پیشوں میں جکڑے ہوئے تھے، اب آزادی کے ساتھ پیداواری عمل میں شرکت کرنے لگے۔بڑے پیمانے پر پیداواری عمل نے اشیاء کی قیمت کم کر دی۔لوگ بڑی آسانی سے چیزوں کو خریدنے کے قابل ہو گئے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ منڈیاں بڑھنے لگیں۔بڑے بڑے صنعتی اداروں کے اردگرد آبادیاں بڑے پیمانے پر بسنے لگیں۔اس میں مزدور بھی شامل تھے اور صارف بھی۔اس سے شہر نشینی (Urbanization) کا سلسلہ شروع ہوا۔

بڑھتی ہوئی شہری آبادی کے ساتھ ساتھ لوگوں کی طرز زندگی میں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔اب لوگ زندگیاں اکٹھے خاندانوں کی شکل میں گزارنے کے بجائے چھوٹی چھوٹی فیملیوں کی شکل میں گزارنے لگے۔اشیاء کی فراوانی اور قوت خرید نے صارفیت (Consumerism) کو فروغ دیا۔مادیت نے ان سب کو مزید بڑھاوا دیا۔چوں کہ حسی تسکین کو سب سے زیادہ اہمیت دی جانے لگی اس لیے افادیت پسندی (Utilitarianism) بڑھنے لگی۔ سرمایہ دار اپنے مفادات کی خاطر پیداوار میں مسلسل اضافہ کرتے چلے گئے۔انہوں نے اس بات کا لحاظ نہ کیا کہ اس کا اثر وسائل قدرت اور ماحول پر کیا پڑے گا۔ایسے طرز پیداوار اپنائے گئے اور ایسی ٹیکنالوجیاں اختیار کی گئیں جو ماحول کے لیے ضرر رساں تھیں۔سرمایہ داری کے جنون نے جارحانہ سرمایہ داری (Predatory Capitalism) کو جنم دیا۔مادیت کے زیر اثر لوگوں میں نمائشی طرز زندگی (Ostentatious Living) کا رجحان پیدا کیا۔نمائشی کلچر نے لوگوں میں بیہودہ صارفیت (Vulgar Consumarism) کو فروغ دیا۔جس میں لوگ ضرورت کے بغیر محض سماج کو دکھانے کے لیے شاپنگ کرنے کی عادت بنالی۔

ان سب کا اثر یہ ہوا کہ ایک ایسا نظام زندگی وجود میں آیا جس میں لوگ خود کو مرکز کائنات سمجھنے لگے اور حسی تسکین کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی۔یہ نظام خدا کا منکر بھی ٹھہرا۔چنانچہ اب حسی تسکین کا حصول ہی مقصد زندگی بن گیا۔نتیجتاً علوم وفنون کو تسکین کے حصول کے لیے اندھا دھند استعمال کیا جانے لگا، اس امر کا لحاظ کیے بغیر کہ وسائل اور ماحول پر اس کے کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔

یہ مادہ پرست نظام اپنے رو میں اس قدر اندھا ہو گیا کہ رفتہ رفتہ اس نے جارحانہ مزاج اپنا لیا۔اس جارحانہ مادہ پرستی کا نتیجہ یہ نکلا کہ دو تین صدیوں کے اندر کرہ ارض اپنے وجود وبقا کی جنگ لڑنے پر مجبور ہو گیا ہے۔اس ماحولیاتی بحران کی ہولناکی کس قدر خطرناک ہے، اس کا مفصل بیان انشاء اللہ اس مضمون کی اگلی قسطوں میں ہوگا۔(جاری)

**SYED AHMED MUZAKKIR**
Director
Centre for Educational Research
and Training (CERT)
New Delhi.

نظر

# ماحولیاتی بحران
# حیات کی بقاء کا مسئلہ

ڈاکٹر عبدالرشید اغوان

اب یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ ماحولیاتی بحران ایک عالمی بحران ہے اور اگر یہ مسئلہ ختم نہیں ہوتا ہے تو زمین پر ایک مرتبہ پھر حیات کا خاتمہ یقینی ہے۔ کم از کم کرہ ارض پر نسل انسانی کا جاری رہنا ضرور ناممکن ہو جائے گا۔ اس مسئلے کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے جہاں یہ ضروری ہے کہ حکومتیں اپنی ذمہ داری کا حق ادا کریں وہیں سماج کا ہر طبقہ اپنا کردار نبھانے کے لیے تیار ہو۔

ماحولیاتی بحران دراصل ایک عالمی فساد ہے جو پچھلے تین سو سالوں میں انسانی معاشرے کی غلط قسم کی ترقی اور نظام قدرت میں بے لگام مداخلت کا نتیجہ ہے۔ کرہ ارض انسانوں کا ہی نہیں بلکہ لاکھوں قسم کی مخلوقات کا ایک بڑا گھر ہے۔ اللہ تعالی نے زمین کو اس طرح بنایا ہے کہ یہاں زندگی ممکن ہوسکی۔ وائرس، بیکٹریا اور چھوٹی چھوٹی دیگر مخلوقات سے لے کر نباتات، حیوانات اور انسانوں کی نسلوں کو جاری رکھنے کے لیے ہر ضرورت اس زمین سے پوری ہوتی ہے۔ سورج کی روشنی، ہوا، پانی، زمین کی معدنیات اور مختلف کیمیکلز کے کئی طرح کے عمل سے زمین پر مخلوقات کی لاکھوں قسمیں میں وجود پاتی ہیں اور اپنی اپنی نسلوں کو جاری رکھتی ہیں۔ گذشتہ 80 سالوں سے سائنسدان اس بات کی باقاعدہ کوشش کر رہے ہیں کہ ہماری زمین کی طرح حیات سے بھرپور کسی اور سیارے کو تلاش کریں کریں۔ مگر اربوں کھربوں روپے خرچ کرنے اور طرح طرح کی دوربینیں اور آلات کا استعمال کرنے کے بعد بھی ایسی کوئی زمین تلاش کرنے میں ناکام رہے ہیں جہاں زندگی کا کوئی امکان ہو۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہماری زمین اللہ تعالی کا ایک نایاب تحفہ ہے۔ لہذا اس کی قدر ہونی چاہیے۔

مگر افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہوا اور یہ زمین انسانوں اور دوسری مخلوقات کے لیے جہنم بنتی جا رہی ہے۔ شہری آبادکاری، فیکٹری اور گاڑیوں سے نکلتا دھواں، پلاسٹک کا عذاب، گاڑیوں میں استعمال کے جانے والے کیمیکل، قدرتی وسائل کا غیر محتاط استعمال اور ان کی بربادی، جنگل اور پیڑوں کی گھٹتی ہوئی سبز چادر، پانی کی بربادی وغیرہ کچھ ایسے عوامل ہیں جن کی وجہ سے زمینی ماحول کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ بلکہ زمین بہت تیزی سے اس راہ کی جانب بڑھ رہی ہے اس کی زندگی شاید ممکن ہی نہ رہے۔ ایک طرف قدرتی وسائل ختم ہو رہے ہیں تو دوسری طرف ان کی آلودگی کا زہر بڑھتا جا رہا ہے۔ قدرتی وسائل کی ایک خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ ایک خودساختہ نظام کی وجہ سے خود بخود بڑھتے رہتے ہیں، مگر موجودہ عالمی بحران کی وجہ سے ان کے اس نظام میں بھی خلل واقع ہو رہا ہے۔

## ماحولیاتی فساد کیا ہے؟

ماحولیاتی فساد ماحول کے قدرتی نظام میں اور اس کے قدرتی وجود میں انسانی دخل اندازی کا نام ہے۔ سائنس و ٹیکنالوجی نے انسان کی ترقی میں مدد کی ہے، انسانی ترقی کی رفتار کو تیز تر بھی کیا ہے مگر ان کے نامناسب

استعمال نے چند ایسے نتائج پیدا کئے ہیں جو براہ راست ماحول اور اس کے نظام کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ مثال کے طور پر کاربن ڈائی آکسائیڈ (CO2) کو ہی لے لیں۔ ہوا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار یار 0.04 فیصد ہوتی ہے۔ مگر پچھلے پچاس سالوں میں اس کی مقدار 48 فیصد تک بڑھ چکی ہے۔ انسان اور جانور ہوا سے آکسیجن جذب کر کے زندہ رہتے ہیں اور کاربن ڈائی آکسائیڈ ہوا میں خارج کرتے ہیں۔ پیڑ پودے ہو سے کاربن ڈائی آکسائیڈ جذب کرتے ہیں اور آکسیجن پیدا کرتے ہیں۔ پچھلے پچاس سالوں میں آدھے سے زیادہ پیڑ اور جنگلات ختم ہو گئے ہیں۔ اس کی وجہ سے انسان اور جانور جو کارب ڈائی آکسائیڈ ہوا میں خارج کرتے ہیں اس کا پورا استعمال پیڑ پودے نہیں کر پا رہے ہیں جس کی وجہ سے کافی مقدار میں کاربن ڈائی آکسائیڈ ہوا میں بچی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ فیکٹریوں، گاڑیوں اور کوڑا کرکٹ جلانے سے ہوا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ اور دوسری نقصان دہ گیسوں کی مقدار ہوا میں بڑھ رہی ہے۔ اس کا ایک نتیجہ تو یہ ہو رہا ہے کہ جانوروں اور انسانوں کو سانس لینے میں پریشانی ہو رہی ہے۔ ان کے پھیپھڑے خراب ہو رہے ہیں اور نت نئی بیماریاں وجود میں آ رہی ہیں وہیں دوسری طرف فضائی تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔ جسے اصطلاح میں کلائمیٹ چینج (Climate Change) کہا جاتا ہے۔ اس تبدیلی کی وجہ یہ ہے کہ کاربن ڈائی آکسائیڈ اور دوسری گیسوں کی ہوا میں بڑھتی مقدار کی وجہ سے گرین ہاؤس ایفیکٹ (Green House Effect) پیدا ہو رہا ہے۔ یعنی سورج کی شعاعوں کا زمین سے ٹکرانے کے بعد الٹراوائلٹ شعاؤں کا جو حصہ واپس خلا میں جانا چاہیے تھا وہ کاربن ڈائی آکسائیڈ اور دوسری گیسوں سے ٹکرا کر زمین کی فضا میں ہی رہ جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں زمین کی حرارت بڑھ رہی ہے اور آہستہ آہستہ زمین کی اوسط حرارت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ پچھلے تین سو سال میں صنعتی انقلاب کے بعد سے زمین کی اوسط حرارت میں 14 ڈگری ڈگری سینٹی گریڈ سے 14.5 ڈگری سینٹی گریڈ تک بڑھ گئی ہے۔ اس کے نتیجے میں بارش کا نظام درہم برہم ہو رہا ہے، کھیتیاں تباہ ہو رہی ہیں، نئی نئی بیماریاں پیدا ہو رہی ہیں، پینے کے پانی کی کمی واقع ہو رہی ہے، انٹارک ٹکا اور دیگر اونچے پہاڑوں پر گلیشئر کی تہہ بہ تہہ جمی ہوئی برف پگھل پگھل کر سطح سمندر میں اضافہ کر رہی ہیں، زمین کے نیچے جمع شدہ پانی میں کمی واقع ہو رہی ہے۔

ہوا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کے علاوہ ہمارے فریج، گاڑیوں کا دھنواں اور پلاسٹک سے لبریز کوڑے کرکٹ کو جلانے کی وجہ سے کئی قسم کے نقصان دہ گیسیں اوزون کی پرت کو نقصان پہنچا رہی ہیں۔ یہ پرت زمین سے 15 سے 35 کلومیٹر اونچائی پر زمین کے چاروں طرف سورج سے آتی ہوئی خطرناک شعاؤں کو روک کر زمین پر زندگی کو الٹراوئیلٹ شعاعوں کے نقصان سے بچاتی ہے۔ لیکن نقصان دہ گیسوں کی وجہ سے پچھلے کئی سالوں میں اوزون کی پرت میں کئی بڑے شگاف پیدا ہو گئے ہیں اور الٹراوائیلیٹ شعاعوں کی بارش بڑھ گئی ہے جس کی وجہ سے زمین پر حیات کو کئی طرح سے نقصان پہنچا ہے۔

اس بات کا اندیشہ ہے کہ 2050ء تک کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار اتنی بڑھ جائے گی کہ اوسط حرارت 15 ڈگری سینٹی گریڈ تک پہنچ جائے گا۔ اس کے گمبھیر نتائج کی پیشین گوئیاں، سائنسدان اور مختلف سائنسی ادارے کرتے رہے ہیں۔

اگرچہ کے ماحولیاتی بحران کے متعدد پہلو ہیں۔ تاہم سب سے زیادہ نقصان دہ پہلو ہوا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کا بڑھنا ہے۔ اسی لیے اس وقت دیگر اقدامات کے علاوہ سبھی کا زور اس بات پر ہے کہ کاربن ڈائی آکسائیڈ کا بڑھنا روکا جائے۔ اس کے لیے سائنسدان، حکومتیں اور تنظیمیں کام کر رہی ہیں۔ اس کے نتیجے میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کے اخراج میں کچھ کمی ضرور درج کی گئی ہے۔ چند بڑے ملکوں مثلاً امریکہ، چین اور کا بھرپور تعاون نہیں ملنے کی وجہ سے کاربن ڈائی آکسائیڈ کم کرنے کی جو رفتار مطلوب ہے وہ حاصل کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ اس بات کا اندیشہ ہے کہ 2050ء تک کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار اتنی بڑھ جائے گی کہ اوسط حرارت 15 ڈگری سینٹی گریڈ تک پہنچ جائے گا۔ اس کے گمبھیر نتائج کی پیشین گوئیاں، سائنسدان اور مختلف سائنسی ادارے کرتے رہے ہیں۔

## عام آدمی کیا کرے؟

ماحولیاتی بحران کا مسئلہ اب محض سائنس دانوں یا اس میدان کے ماہرین یا حکومتوں کا مسئلہ نہیں رہ گیا ہے۔ یہ آج انسانی وجود اور حیات کی بقاء کا مسئلہ بن چکا ہے۔ ہم اور ہماری آنے والی نسلیں باقی رہ سکیں گی یا نہیں یہ ماحولیاتی بحران کے حل پر منحصر ہے۔ اس وجہ سے ماحولیاتی بحران کا مسئلہ اب ہر انسان کا کا ذاتی معاملہ بن چکا ہے۔ اس مسئلے میں ہم میں

سے ہر ایک کو اپنا اپنا کردار ادا کرنا ہوگا، جس کے بعض پہلو یہاں درج کیے جارہے ہیں:

1) ماحولیاتی بحران پر عام بیداری کے لیے کوشش کرنی ہوگی تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ وجود کی اس جنگ میں حصہ لے کر اسے طاقت ور بنا ئیں سکیں۔

2) حکومتوں پر دباؤ ڈالنا ہوگا کہ ان کی پالیسیاں اور فیصلے پائیدار ترقی کے ضامن ہوں۔ حکومتیں وقتی فائدوں اور چند افراد اور کمپنیوں کے مفادات کو درکنار کر کے ترقی کا ایسا نقشہ پیش کریں جس سے کہ اس بحران کا جلد از جلد خاتمہ ممکن ہو سکے۔

3) ہم میں سے ہر شخص کو ایک ایسی طرز زندگی اختیار کرنا ہوگا اور اسے فروغ دینا ہوگا جو پائیدار ترقی کو ممکن بنائے۔ مثال کے طور پر پانی کی بربادی دی، ہوا اور پانی کو آلودہ ہونے سے بچانا، گاڑیوں کا استعمال بقدر ضرورت ہی کرنا، زیادہ سے زیادہ شجر کاری کرنا، فریج اور ایئر کنڈیشن کا کم سے کم استعمال، مختلف قسم کے خطرناک کیمیکلز کا کم سے کم استعمال وغیرہ۔

## ماحولیات کا تحفظ بھی عبادت ہے!

اسلام میں ماحولیات کے تحفظ سے متعلق اعمال کو عین عبادت بتایا گیا ہے۔ اور ان سے غفلت ولا پرواہی کو نقصان دہ اور اللہ کے عذاب کا باعث بتایا گیا ہے۔ قرآن کریم میں 250 سے زیادہ آیتیں اور سیکڑوں احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم ماحولیاتی تعلیم فراہم کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر سورہ الرحمن کی آیات 07 تا 09 میں زمین اور آسمان کے درمیان قائم نظام کی پرواہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ سورہ روم کی چند آیات میں ماحولیاتی بحران کے حوالے سے فساد فی البر والبحر کا تذکرہ آیا گیا ہے۔ اسی طرح سورہ دخان میں ہوا کی آلودگی کو اللہ تعالی کا عذاب بتایا گیا ہے۔ بہت سی آیات میں فرمایا گیا ہے کہ "کھاؤ پیو، مگر برباد نہ کرو"۔ کھانے کی اشیاء کو برباد کرنے والے کو شیطان کا بھائی بتایا گیا ہے۔ فطری نظام میں رخنہ اندازی کو عمل کو شیطانی عمل قرار دیا گیا ہے۔

اسی طرح بے شمار احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں پانی کو نقصان نہ پہنچانے، کھانے کو ضرورت سے زیادہ استعمال نہ کرنے، اسے برباد نہ کرنے نعمتوں کو شکر گزار بن کر استعمال کرنے وغیرہ کی تعلیم دی گئی ہے۔ مثال کے طور پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ وضو کے لیے ایک مگ پانی (750ml) اور غسل کے لیے ایک صاع پانی (05 لیٹر سے کم) سے زیادہ استعمال کرنا ناپسندیدہ ہے۔

روزمرہ کی زندگی میں ہم کئی ایسے کام کر سکتے ہیں جو ماحولیاتی بحران کے خاتمے کے لیے ہمارا عملی کار خیر ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر:

1) گھر میں یا گھر کی چھت پر، گلی میں اور آس پاس کی بستی میں، سڑکوں پر، کھیتوں پر، خالی پڑی زمین پر زیادہ سے زیادہ پیڑ اور پودے لگائیں۔

2) پانی کو فلٹر کرنے سے جو دو تہائی پانی نالی میں چلا جاتا ہے، اسے بچا کر نہانے کے لئے، کپڑے دھونے کے لئے، سائزنگ یا کارخانوں یا اس طرح کے دوسرے کاموں میں استعمال کریں۔

3) ایئر کنڈیشن کا استعمال کم سے کم کریں اور اس کی حرارت 25 ڈگری تا 28 ڈگری سے کم نہ رکھیں۔

4) گاڑیوں کا استعمال بقدر ضرورت ہی کریں۔ کم دوری کے راستوں کو پیدل طے کریں۔ الیکٹرک گاڑیوں کا استعمال کریں۔ گاڑیوں کی سروس وقت پر کرائیں۔ اس کا Pollution Check وقت پر کرائیں۔

5) غسل، کپڑے دھونے، برتن دھونے، وغیرہ کے لیے کم سے کم پانی کا ستعمال کریں۔

6) گھر اور قریبی مسجد میں وضو کے لئے پانی بچانے والے نلوں اور ٹونٹیوں کا استعمال یقینی بنائیں۔

7) پلاسٹک کے استعمال سے بچنے کی کوشش کریں۔ سامان خریدنے کے لیے کپڑے کی تھیلی گھر سے لے جائیں تاکہ پولی تھین (Poly Thene) کا استعمال کم ہو۔

8) کچن کے کوڑے اور گھر کے دوسرے کوڑے کرکٹ کو الگ الگ رکھیں۔ کوڑے کو ری سائیکل (Recycle) کرنے پر زور دیں۔

9) گھر میں کئی چیزوں کا استعمال کم کریں۔ مثال کے طور پر کاغذ، پیکنگ کی چیزیں، پلاسٹک کے برتن، پارٹی میں پلاسٹک یا چارکول کی بنی ہوئی چیزیں، ریفل ختم ہونے پر پرنیا قلم خریدنا، پلاسٹک کے کھلونے، پانی کے لیے پلاسٹک کی بوتل کا استعمال وغیرہ۔

10) ضرورت سے زیادہ کھانے، ہوٹلوں میں کھانے اور کھانے کی اشیاء کو ضائع کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔

**DR ABDUL RASHID AGWAN**
President, Institute of Policy Studies
Writer "Islam And The Environment"
New Delhi
Phone: 9718506980

نظر

# ماحولیاتی بحران کا فکری مطالعہ

## (مذہبی اور سیکولر نظریات کا تقابل اور اسلامی تعلیمات)

ڈاکٹر شاہ محی الدین ہاشمی

عصرِ حاضر میں انسانیت کو درپیش سنگین مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ ''ماحولیاتی فساد'' ہے جس نے آج پوری انسانیت کو تباہی کے خطرات سے دوچار کر دیا ہے۔ دنیا بھر کے اہل علم، فضلاء اور سائنسدانوں کے ہاں گزشتہ کئی عشروں سے یہ موضوع زیرِ بحث ہے جو کرۂ ارض پر زندگی کو درپیش خطرات کی سنگینی سے مسلسل آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ ماحولیاتی تحفظ کے موضوع کو ہدفِ تحقیق بنا رہے ہیں۔ ماحولیاتی بحران کے حل اور ماحولیاتی اخلاقیات کی تشکیل میں مذہب کا کیا کردار ہے؟ یہ آج کا اہم زیرِ بحث سوال ہے۔ مذہب اور ماحولیات کے اس مباحثہ میں مذہبی اور سیکولر نقطہ ہائے نظر کا تقابل بڑی دلچسپی اور اہمیت کا حامل ہے جو زیرِ نظر مقالہ کا مرکزی موضوع ہے۔ اس بحث سے ان فکری بنیادوں کی بھی نشاندہی ہوتی ہے جو ماحولیاتی بحران کا باعث بنی ہیں۔

### ماحولیاتی بحران کی فکری بنیادیں مذہبی اور سیکولر نقطہ ہائے نظر

مذہبی نقطۂ نظر کے حامل موجودہ بحران کا ذمہ دار جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کے زیرِ اثر وجود میں آنے والی تہذیب کو قرار دیتے ہیں جب کہ سیکولر نقطۂ نظر اس کا ذمہ دار مذہب اور مذہبی طبقہ کو گردانتا ہے۔ دونوں کے نقطۂ نظر کے اختلاف کے باوجود اس بحث اور مکالمہ (Debate) کی افادیت اس حد تک ضرور ہے کہ ہر دو طبقے اس خطرہ کی سنگینی پر متفق ہیں اور اس مسئلہ کے حل میں سنجیدہ دکھائی دیتے ہیں۔ اس امر کا اظہار مئی 1992ء میں واشنگٹن ڈی سی میں مذہبی اسکالرز اور سائنسدانوں کے مشترکہ اجتماع نے "Joint Appeal by Science and Relegion on the Environment" کے عنوان سے جو اعلامیہ جاری کیا، اس سے بھی ہوتا ہے جس میں ماحولیاتی بحران سے نمٹنے کے لیے مشترکہ کاوشوں پر اتفاق کا

اظہار کیا گیا ہے۔[1] اس حوالے سے John F. Haught نے اپنی مشہور تصنیف "Science and Religion" میں "Is Religion Responsible for the Ecological Crises" کے عنوان کے تحت اس موضوع پر عمدہ بحث کی ہے،[2] جو لائقِ مطالعہ ہے۔

## مذہبی نقطۂ نظر

مذہبی نقطۂ نظر کے مطابق ماحولیاتی بحران کی ذمہ دار وہ مادی تہذیب ہے جو مغرب میں نشاۃ ثانیہ کی تحریک کے نتیجے میں وجود میں آئی ہے۔ اس تحریک نے عقل پرستی، مذہب سے بغاوت، اقدار کی نفی اور مشینی کائنات کے تصور پر مبنی رجحانات کو فروغ دیا اور ایسی تہذیب کو جنم دیا جس نے مادی خواہشات کی آزادانہ تکمیل کو اہم ترین انسانی نصب العین قرار دیا۔ کائنات سے خدا کی بے دخلی اور اس پر انسان کی حکمرانی کے تصور، فطرت پر قبضہ اور اس کے استحصال کو ممکن بنانا سائنس اور ٹکنالوجی انہی مقاصد کی تکمیل کا زینہ بن گئی اور اس کا رخ تعمیر کے بجائے تخریب کی طرف موڑ دیا گیا۔ اس کے آزادانہ اور مجنونانہ استعمال کے نتیجہ میں آج زندگی کا فطری توازن درہم برہم ہو چکا ہے بلکہ خود زندگی کے معدوم ہونے کا خطرہ پیدا ہو چکا ہے۔ آب وہوا، زمین اور فضا، جنگلی و آبی حیات کی تباہی کو ممکن بنانے میں دراصل مادی خواہشات، اندھی مسابقت اور بے لگام تلذذ پسندی کا بڑا عمل دخل ہے جو خدا و آخرت کے تصور، اخلاقی اقدار اور مذہب سے بیگانگی کا نتیجہ ہے اور جس کے سوتے مغربی فکر و فلسفہ سے پھوٹتے ہیں۔ مشہور معاصر اسلامی مفکر حسین نصر کے الفاظ میں:

> "The Environment crisis may infact be said to have been accused by man's refusal to see God as the real environment which surrounds him and nourishes his life."[3]

## سیکولر نقطۂ نظر

سیکولر نقطۂ نظر کے حامل بعض ماہرین ماحولیات مثلاً Russel Train، Johan Passmore اور Lynn White وغیرہ مذہب پر ماحولیات اور فطرت (Nature) سے لاتعلقی، غفلت اور دیگر ماحولیاتی مسائل کو نظر انداز کرنے کا الزام عائد کرتے ہیں۔[4] ان کے خیال میں کرۂ ارض پر زندگی کی قدر و قیمت کا اندازہ مذہب کو بہت کم ہے کیونکہ مذہب کو اخروی دنیا کی اتنی فکر ہے کہ اس کی توجہ اس دنیا کی بہبود کے لیے ناکافی دکھائی دیتی ہے۔ مذہب چونکہ فطری دنیا کو ہمارا حقیقی وطن تسلیم کرنے کے بجائے اس سے ماوراء آخرت کو قرار دیتا ہے اور انسان کو زمین پر عارضی مسافر سمجھتا ہے لہٰذا اس قسم کا غیر دنیاوی نقطۂ نظر ماحولیاتی اصلاح میں معاون نہیں بن سکتا۔ اس کے برعکس "Naturalistic Philosophy" اپنے اس مفہوم میں کہ فطری دنیا ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی ماحولیاتی اخلاقیات کو مناسب بنیاد فراہم کرتی ہے کہ انسان اسے عزیز رکھیں۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق:

> "The consolation of final destiny actually makes room for ecological abuses in the present."[5]

Lynn White نے اپنے مشہور تھیسس (Thesis)، "The Historical Roots of our Econogical Crisis" میں ماحولیاتی بحران کی اصل بنیاد، بائبل کی کتاب پیدائش (1:16-29) کی تعلیم کو قرار دیا ہے جس کی رو سے انسان فطرت سے بالاتر ہے وہ کائنات کی خاص الخاص مخلوق ہے اور اسے فطرت کی تسخیر اور اس پر غلبہ کا حکم دیا گیا ہے۔[6] اسی طرح توحیدی مذاہب کے ہاں انسان کی مرکزیت کے فخریہ تصور نے فطرت کو محکوم بنانے اور اس کے بے جا استعمال کو ممکن بنایا ہے۔ یہ مذہبی ذہنیت ہی ہے جو مذہب پر اعتقاد رکھنے والوں کو اجازت دیتی ہے کہ وہ اس دنیا کے متعلق یہ تصور کریں کہ وہ تباہی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ چونکہ بالآخر اس کا فنا ہونا ہی مقدر ہو چکا ہے اس لیے موجودہ ماحولیات کے تحفظ کا کوئی فائدہ نہیں۔

مختلف عیسائی اہلِ علم نے بائبل کے موقف کی یہ توجیہ کی ہے کہ فطرت کی تسخیر اور اس پر حکومت سے مراد خدا کے نمائندہ کی حیثیت سے اس کے ساتھ برتاؤ ہے، جب زندگی کی بقاء اور حفاظت خدائی فعل ہے تو وہ انسان کو بھی اس معاملے میں ہدایت کرتی ہے کہ وہ خدا کو نمونہ بنائیں۔ لہٰذا فطرت پر انسانی تسلط اور اس کے استحصال کا کوئی جواز بائبل میں موجود نہیں۔ اس کے برعکس مذہبی اور دینیاتی ماخذ میں بہت سے ایسے حوالے موجود ہیں جو دنیائے فطرت کے احترام اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری ہم پر عائد کرتے ہیں۔[7]

مسلم اسکالر حسین نصر، فطرت کی تسخیر کے مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "It means th dominion over things which man is allowed to exercise only on the condition that it be according to God's

laws and precisely because he is God's Vicegerent on Earth."[8]

## ماحولیاتی بحران کے حقیقی اسباب، مذہب کی نفی اور اقدار کا بحران

اس سے یقیناً اختلاف ممکن نہیں کہ ماحولیاتی بحران سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے نتیجے میں وجود میں آیا ہے۔ غیر سائنسی دور کے ہزاروں سالوں کی کائناتی تباہی سے سائنسی دور کی ایک گھنٹہ کی تباہی زیادہ ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ سائنس بذات خود مجرم ہے بلکہ یہ تو خدائی عطیہ ہے جس نے کائنات کی قوتوں کی تسخیر اور ان سے استفادہ کو ہمارے لیے ممکن بنایا ہے۔ جدید سائنس کی نشو ونما چونکہ مغرب میں الحاد و دہریت کے زیرِ اثر ہوئی ہے اس لیے وہ ہر قسم کے نظام اقدار سے عاری ہے اس کا تمام تر ہدف مادی ترقی ہے اس نے روحانی ارتقاء کو سرے سے نظر انداز کر رکھا ہے اور نتیجتاً انسان من حیث الکل ترقی سے محروم ہے۔ مادیت پرستی (Secular Materialism) کے زیر اثر تہذیب خدا اور آخرت کے تصور سے بالکل نا آشنا ہے اور اس کی بنیاد خود غرضی، مفاد پرستی اور استحصال پر قائم ہے جس میں انسان کا منتہائے مقصود تن آسانی، تن پروری، لذت طلبی اور حیوانی جذبات کی تسکین اور نفسانی خواہشات کی تکمیل کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ جدید ذرائع و وسائل آج انسانی ترقی کے بجائے انسانی بربادی میں استعمال ہونے لگے ہیں اور مادی ترقی کے عروج پر پہنچ کر بھی انسان روحانی قدروں کا خلا محسوس کر رہا ہے جس کے تباہ کن نتائج آج ساری دنیا بھگت رہی ہے۔ اس کی ترجمانی علامہ اقبال نے ان اشعار میں کی ہے:

یورپ از شمشیرِ خود بسمل فتاد
زیرِ گردوں رسمِ لادینی نہاد
مشکلاتِ حضرتِ انسان از واست
آدمیت را غمِ پنہاں از واست

جدید مادی تہذیب نے انسان کو خدا اور فطرت سے الگ کر کے نہ صرف اس کی روح کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے بلکہ اب اس کے سبب پیدا ہونے والے ماحولیاتی فساد کے باعث اس کا طبعی وجود بھی خطرے میں پڑ چکا ہے، اس لیے دنیا بھر کے سائنسداں، مفکرین اور دانشور ماحولیاتی بحران کے اسباب و محرکات کی تلاش و تحقیق کے ساتھ ساتھ اس اجتماعی خطرہ سے نمٹنے کے لیے کوشاں ہیں۔ مسلم اور غیر مسلم اسکالرز ماحولیاتی بحران کو اخلاق و اقدار کا بحران قرار دے رہے ہیں، جو دراصل انسانی زندگی میں روحانی خلا کا نتیجہ ہے۔ مختلف مفکرین نے ماحولیاتی بحران کا تجزیہ کرتے ہوئے حرص و طمع، غربت و افلاس، دولت کی غیر منصفانہ تقسیم، کثرت آبادی، لامحدود اقتصادی ترقی کا مطمع نظر، انڈسٹریلزم، نیشنلزم، ملٹری ازم، کنزیومرزم اور مادیت پرستی وغیرہ اسباب کی نشاندہی کی ہے اور اس کے حل کے لیے اخلاقی و روحانی اقدار مثلاً انکساری (Humility)، شکر گزاری، انصاف، رحم اور زندہ مخلوقات سے محبت پر زور دیا ہے مگر یہ حقیقت نظر انداز کر دی کہ اخلاق و اقدار کا اصل منبع مذہب ہے نہ کہ الحاد و لادینیت اور مذہب کے بغیر ان اقدار کا تصور ممکن نہیں۔ موجودہ صورتحال دراصل فرد اور معاشرے پر مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑنے کا نتیجہ ہے کیونکہ انسانی سیرت و کردار کی اصلاح اور اخلاقی بگاڑ کے سدباب کے لیے مذہب سے بڑھ کر مؤثر اور طاقتور محرک کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا۔ نیویارک اکیڈمی آف سائنس کے صدر اے۔ کریسی ماریس کے الفاظ میں:

> ''ادب و احترام، فیاضی، کردار کی بلندی، اخلاق، اعلیٰ خیالات اور وہ سب کچھ جنہیں خدائی صفات (Divine Attributes) کہا جاسکتا ہے وہ کبھی الحاد سے پیدا نہیں ہوسکتیں جو کہ دراصل خود بینی کی عجیب و غریب قسم ہے جس میں آدمی خود اپنے آپ کو خدا کے مقام پر بٹھالیتا ہے۔ عقیدے اور یقین کے بغیر تہذیب تباہ ہوجائے گی۔ نظم بے نظمی میں تبدیل ہوجائے گی، ضبط نفس اور اپنے آپ پر کنٹرول ختم ہوجائے گا اور برائی ہر طرف پھیل جائے گی۔ ضرورت ہے کہ ہم خدا پر اپنے یقین کو دوبارہ مضبوط کریں۔''[9]

خدا اور آخرت کا تصور ایک ذمہ دار اور متوازن شخصیت کی تکمیل اور صالح تمدن کے قیام کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ وحیدالدین خان کے الفاظ میں ''حقیقت یہ ہے کہ وہ سب کچھ جو تمدن کی تعمیر کے لیے درکار ہے، اس کا واحد اور حقیقی جواب صرف مذہب کے پاس ہے۔ مذہب ہمیں حقیقی، قانون ساز کی طرف رہنمائی کرتا ہے وہ قانون کی موزوں ترین اساس فراہم کرتا ہے، وہ زندگی کے ہر معاملے میں وہ صحیح ترین بنیاد فراہم کرتا ہے جس کی روشنی میں ہم زندگی کا مکمل نقشہ بنا سکیں۔ وہ قانون کے لیے وہ نفسیاتی بنیاد فراہم کرتا ہے جس کی عدم موجودگی میں قانون عملاً بے کار ہو کر رہ جاتا ہے وہ سوسائٹی کے اندر وہ موافق فضا پیدا کرتا ہے جو کسی قانون کے نفاذ کے لیے ضروری ہے اس طرح مذہب ہمیں وہ سب کچھ دیتا ہے جس کی ہمیں اپنے تمدن کی تعمیر کے لیے ضرورت ہے جبکہ لامذہبیت ان میں سے کچھ نہیں دے سکی اور نہ حقیقتاً دے سکتی ہے۔''[10]

سیکولر نقطۂ نظر اخروی عقیدہ کو ماحولیاتی تباہی کا ذمہ دار قرار دیتا ہے حالانکہ اس کے برعکس اس مادی دنیا پر اعتقاد کا نظریہ آخرت پر اعتقاد کے مقابلے میں ماحولیاتی اعتبار سے زیادہ نقصان دہ ہے۔ سائنسی میٹریلزم اور کائناتی قنوطیت (Cosmic Pessimism) ماحولیاتی اخلاقیات سے مطابقت نہیں رکھتی۔ John Haught کے الفاظ میں:

> "If every thing is destined for "absolute nothingness" could we truly treasure it? and since materalism views the universe as ultimately a final wreck and tragedy. "How can such a philosophy ever motivate us to care for the earth' beautiful treasures? we doubt that it can."[11]

> ''اگر ہر چیز کا مقصد مطلق معدومیت ہے تو کیا ہم اس چیز کو سنبھال کر رکھنا گوارا کریں گے اور جب میٹریلیزم کائنات کا انجام بالآخر تباہی و بربادی قرار دیتا ہے تو اس قسم کی فلاسفی ہمیں کب ترغیب دے سکتی ہے کہ ہم زمین کے خوبصورت خزانوں کی حفاظت کریں؟ ہمیں یقین نہیں کہ ایسا ممکن ہے۔''

آخرت پر اعتقاد ہمیں دعوت دیتا ہے کہ ہم فطرت کو عزیز رکھیں کیونکہ فطرت بذاتِ خود اپنے اندر اس مستقبل کو لیے ہوئے ہے جس کے ہم خواہشمند ہیں، لہٰذا فطرت کی تباہی دراصل اپنے آپ اور کائنات کو اپنے مستقبل سے کاٹ دینا ہے تمام موجودات کی اخروی تجدید کی امید موجودہ دور اور دنیا کی اخروی تکمیل کے درمیان پیدا کرتی ہے۔ خوبصورت ماحول، فطری خواہشات کی تسکین، لطف و سرور اور امن و سکون کی خواہش فطری ہے مگر موجود دنیا اس کی تکمیل کے لیے ناکافی ہے۔ اس کے لیے مذہب جنت کا تصور پیش کرتا ہے جو ان ساری خواہشات کے پوری ہونے کی جگہ ہے۔
وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيٓ أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ (31:41)

اخروی عقیدہ ہم سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ ہم زمین اور فطرتی دنیا کو جنت کی حیثیت سے نہ دیکھیں، ہمیں اس سے کمال (Perfection) کی توقع نہیں بلکہ اس کے تکملہ (آخرت) سے امید رکھنی چاہیے۔ اس طرح ہم اس کی خامیوں کو بھی گوارا کر سکتے ہیں۔ مذہبی عقیدہ کی رو سے صرف لامحدود دنیا ہی ہماری لامحدود خواہشات کی تسکین کا سامان بہم پہنچا سکتی ہے۔ دراصل کئی ایک ماحولیاتی مسائل انسان کی اس شدید خواہش کا نتیجہ ہیں کہ وہ اپنے لیے ایک ارضی بہشت تخلیق کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے فطرت کی نعمتوں اور قدرت کے عطا کردہ قیمتی وسائل کو اندھا دھند استعمال کرنے لگتا ہے۔ جب کہ بہشت کا حصول اس دنیا میں ممکن نہیں۔ البتہ مذہبی صحائف اور قرآن میں ذکر کردہ وہ جنت کی تشبیہات و تمثیلات ایک بلند و پرشکوہ نصب العین (Utopia) مقرر کرتی ہیں تاکہ یہ دنیاوی زندگی ہمیشہ ایک اعلیٰ ترین مقام کمال تک رسائی کی جدوجہد خدا کی ہدایت کی روشنی میں کرتی رہے۔

یہ بات خالی از دلچسپی نہ ہوگی کہ آخرت کے تصور کا انسانی اخلاقیات کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ قیامت کے متعلق مذہب کا یہ اعتقاد ہے کہ اس دن ہر شخص کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا کیونکہ وہ روزِ جزا ہے۔ یہ عقیدہ لوگوں میں ذمہ داری کا شعور پیدا کرتا ہے۔ Simon جو کہ ماحولیاتی تاریخ کا فاضل ہے، اخروی عقیدہ کی اہمیت کو نمایاں کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> "All human activities must be based on the idea that the earth is only a temporary home (even though man is a superior being) and that to find favour in the next world our action must be properly administered as a manifestation of faith. These include justice and piety plus the appropriate knowledge and understanding of environmental problems."[12]

> ''تمام انسانی سرگرمیوں کی بنیاد اس تصور پر ہونی چاہیے کہ زمین ایک عارضی گھر ہے اور اگلے جہاں میں رحم و کرم کے حصول کے لیے ہمارے اعمال عقیدے کے اظہار کے طور پر ٹھیک طرح صادر ہونے چاہئیں، یہ اعمال عدل و انصاف اور رحم و کرم پر مشتمل ہونے چاہئیں اور اس کے ساتھ ساتھ مناسب علم اور ماحولیاتی مسائل کا فہم بھی ضروری ہے۔''

اس بحث سے ہمیں اس نتیجے تک پہنچنے میں مدد ملتی ہے کہ زمین کے ماحولیاتی نظام کو تباہ کرنے کی اجازت مذہب کے زیرِ اثر نہیں بلکہ مذہبی شعور کی کمی کا نتیجہ ہے۔ John Haught اسی نقطۂ نظر کی تائید کرتے ہوئے سیکولرازم کو اس کا اصل قصوروار ٹھہراتا ہے جس نے کائنات سے خدا کو بے دخل کر کے Humanism، Rationalism اور Scienctism کو

موقع فراہم کیا کہ وہ اس خلا کو پُر کریں۔ انہی تصورات کے زیرِ اثر فطرت پر انسانی تسلط کا تصور پروان چڑھا۔ اس کے الفاظ درج ذیل ہیں:

"It is not religious influence but the lack of it that has allowed us to destory the earth's eco systems. the banishment of God by Modern secularism has made it possible for rationalism, humanism and sceintism to rush in and fill the void, and there all thrive on the assumption of our human supermacy over nature." (13)

## اسلام اور ماحولیات

مختلف عالمی مذاہب یہودیت، عیسائیت اور بدھ مت کے تناظر میں مذہب اور ماحولیات کی بحث مغربی مفکرین اور اہلِ علم کے ہاں کچھ عرصے سے جاری ہے مگر اس میں اسلام کا نقطۂ نظر مشکل سے کہیں نظر آتا ہے۔ حالانکہ اسلام کا مؤقف بھی اتنا ہی توجہ کا طالب ہے جتنا دیگر مذاہب اور تہذیبوں کا۔ بلکہ اسلام کا نقطۂ نظر مذہب اور ماحولیات کے اس مکالمہ میں اپنی اہلیت اور معقولیت کی بناء پر بھی کہ اسلام ایک عالمگیر اور آفاقی دین ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی تعلیمات کے ابدی اور فطری اصولوں پر مبنی ہونے کا دعویدار رہے اور اسے اصرار ہے کہ وہ مختلف النوع علمی، تہذیبی و تمدنی مسائل میں انسانیت کی رہنمائی کی اہلیت رکھتا ہے اور اس کی تعلیمات موجودہ ماحولیاتی عذاب سے نسل انسانی کو محفوظ رکھنے کا جامع حل پیش کرتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آج سوائے اسلام کے کسی مذہب میں اتنی استعداد نہیں کہ وہ فکرِ انسانی کو صحیح رخ پر ڈالے، اور غلط رجحانات کو روکنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ ایک مسلم مفکر کے الفاظ میں ٹیکنالوجی کی ترقی اگر اسلامی اصولوں کے مطابق ہو تو وہ کبھی بھی ان خوفناک نتائج تک نہیں پہنچائے گی جو مغرب میں ظاہر ہوئے ہیں کیونکہ سائنس کو اسلام میں اقدار سے کبھی بھی جدا نہیں کیا گیا۔

"An Islamic technological development could never lead to the same disastrous results as in the West simply because science was never divorced from values in Islam."(14)

اسلام میں Natural Science کے زوال کے دیگر نمایاں اسباب بھی ہیں لیکن بعض مسلم مفکرین کی رائے کے مطابق اس معاملے میں زیادہ دباؤ علوم اخلاق کی طرف سے تھا جو مسلم سوسائٹی میں سائنسی ارتقاء میں رکاوٹ کا باعث بنا۔

## خدا، انسان اور فطرت

مذہب اور ماحولیات کے مباحثہ میں چند موضوعات بڑی اہمیت اختیار کر چکے ہیں۔ مثلاً خدا، انسان اور فطرت کا باہمی تعلق، کائنات میں انسان کی حیثیت اور فطرت کے تحفظ کے لیے انسان کا کردار اور اس کی شرعی ذمہ داریاں۔ آئندہ سطور میں ہم اپنی بحث کو انہی نکات تک محدود رکھتے ہوئے اسلام کے نقطۂ نظر کی وضاحت کریں گے۔ دراصل انہی نکات کی بہتر تفہیم میں ہمارے ماحولیاتی مسائل کا حل پوشیدہ ہے۔

## خدا کا تصور و عقیدہ

مذہب اور خدا پر اعتقاد انسان کو یہ احساس عطا کرتا ہے کہ وہ خدائی نظام میں باضابطہ منصوبہ کے تحت وجود میں آنے والا ایک یونٹ ہے اور خدائی نظام کا ایک ناگزیر اور اہم جزو ہے۔ یہ عقیدہ خالق و مخلوق کی وحدت اور تمام موجودات کے باہمی مربوط ہونے کا تصور دیتا ہے۔ اس کے برعکس شرک کا تصور کائنات کو غیر آہنگ و متفرق اشیاء کا مجموعہ قرار دیتا ہے، اس کی رو سے کائنات متفرق، متضاد، بے ربط ارادوں اور خواہشات کا مجموعہ ہے۔ شرک دنیا کو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کرتا ہے جس کا نتیجہ تخلیقی دنیا کے غلط استعمال کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ اسلام کا تصور ثنویت (Dualism) پر مبنی تمام مفروضہ صورتوں کو مسترد کرتا ہے۔ یہ تصور ماحولیاتی (Context) میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ انسان، کائنات اور اس کے مختلف اجزاء کے درمیان خالق اور مخلوق کے رشتہ و تعلق کو نمایاں کرتا ہے اس طرح کائنات میں بقائے باہم کا اصول قائم ہوتا ہے۔ جو اس کی وحدانیت کا لازمی تقاضا ہے۔ ایک خالق پر ایمان یہ تعلیم دیتا ہے کہ ہر قسم کی زندگی لازمی طور پر متحد ہے کیونکہ وہ خدائی وحدت کا نتیجہ ہے۔ اس سے انسان میں عجز و انکساری، ذمہ داری اور فطرت کے احترام کے جذبات کی نشوونما ہوتی ہے۔ خدا پر ایمان بندے کو خدائی صفات اپنانے کی دعوت دیتا ہے۔ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ۔ (الحدیث) اللہ کی بعض صفات جن کی نشاندہی اس کے صفاتی اسماء سے ہوتی ہے، ماحولیاتی سیاق میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کے نمایاں نام رحمن اور رحیم ہیں یعنی مہربان اور کریم۔ ایک مسلمان جو اپنے اندر خدائی صفت پیدا کرنا چاہتا ہے اسے رحم و کرم جیسی صفات کا اظہار، خدا کے نمائندے کی حیثیت سے منشاءِ ربانی کی تعمیل کرتے ہوئے ساری مخلوق سے کرنا ہوگا جسے اللہ نے

پیدا کیا ہے۔ یہ تصور تمام مخلوقات کے تحفظ کی ضمانت بن سکتا ہے۔ خدا کے خالق، رزاق، مالک اور حفیظ صفات انسانی زندگی اور فطرت کے تحفظ و بقاء پر دلالت کرتی ہیں اور یہی صفات خدا کا خلیفہ ہونے کی حیثیت سے بندوں سے بھی مطلوب ہیں۔ یہ تصور ماحولیاتی تحفظ کے لیے ایک نظریاتی بنیاد فراہم کرتا ہے۔

## کائنات میں انسان کی حیثیت

اللہ تعالیٰ نے ایک متوازن اور متناسب کائنات کی تخلیق کے بعد انسان کو پیدا کیا اور اسے اشرف المخلوقات قرار دے کر زمین میں خلافت و نیابت کا منصب عطا کیا۔ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً۔ (الآیہ 2:30) اس منصب جلیل پر فائز کرنے کے لیے اسے ''علم الاسماء'' کی تعلیم دی: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّہَا۔ (الآیہ 2:31) تاکہ وہ فطرت کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ اس سے استفادہ خدا کی ہدایت کی روشنی میں کرے اور اس خدائی منصوبے میں شریک ہو جو اس کی تخلیق کے پس پشت کارفرما ہے۔ قرآن کی رو سے انسان پر خصوصی اعتماد کرتے ہوئے خدا کی طرف سے ایک ذمہ داری (امانت) اسے سونپی گئی ہے یعنی قوانین الٰہیہ کا پابند ہونے کی جسے اس نے رضا کارانہ طور پر قبول کیا۔ جس میں زندگی کا احترام اور فطرت کا تحفظ بھی داخل ہے۔

فطرت دراصل ایک ریاست ہے جس کا مالک خدا ہے۔ یہ ریاست انسان کو بطور امانت عطا ہوئی ہے۔ انسان اس کا مرکز و محور ہونے کے باوجود کائنات کے حاکم اعلیٰ کا ماتحت اور اس کا ایک نائب ہے جس کے پاس کوئی اختیار و اقتدار نہیں سوائے اس کے جو اسے فطرت کے محافظ، نگران اور منتظم کی حیثیت سے عطا ہوا ہے۔ اس طرح انسان کے لیے فطرت کو آزمائش گاہ اور اس کی اخلاقی سرگرمیوں کا امتحان قرار دیا گیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً۔ (2:27)

''اس نے زندگی اور موت اس لیے پیدا کی تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے اچھا عمل کون کرتا ہے۔''

اسلام کا یہ عطا کردہ خلافت و امانت کا تصور ماحولیاتی اخلاقیات کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرسکتا ہے۔ قرآن نے انسانی فطرت کے منفی پہلوؤں کا بھی ذکر کیا ہے کہ وہ بے انصاف اور نادان ہے۔ (72:33) وہ انتہائی ناشکرا ہے۔ (66:22)، اسے جلد باز بنایا گیا ہے۔ (11:17) وہ حدود سے تجاوز کرنے والا ہے۔ (96:7-6) وہ بے صبرا اور بخیل ہے۔ (20:70-19) انہی منفی پہلوؤں کے زیر اثر وہ فطرت سے برتاؤ کرنے میں تخریب پسند، لالچی اور ناعاقبت اندیش واقع ہوا ہے۔ اسلام انسانی شخصیت کے ان منفی پہلوؤں کی جو ماحولیاتی فساد کا باعث بنتے ہیں۔ اخلاقی اصولوں اور عقیدوں کے ذریعے اصلاح کرتا ہے۔

اسلام کی نظر میں خلافت و امانت کی ذمہ داریوں سے انکار، خدا اور فطرت سے بیگانگی ہے جس کا نتیجہ فساد کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ اسی لیے اسلام ماحولیاتی تباہی کا ذمہ دار بھی انسان ہی کو قرار دیتا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

ظَھَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا کَسَبَتْ اَیْدِی النَّاسِ لِیُذِیْقَھُمْ بَعْضَ الَّذِیْ عَمِلُوْا لَعَلَّھُمْ یَرْجِعُوْنَ۔ (41:30)

''خشکی اور تری میں فساد رونما ہو چکا ہے جو انسانی اعمال کا نتیجہ ہے تاکہ ان کے بعض اعمال کا انہیں مزہ چکھائے اور تاکہ وہ رجوع کرلیں۔''

ہمارے خیال میں ''فساد'' کی تشریح ماحولیاتی سیاق میں ماحول کی آلودگی اور تباہی سے بھی کی جاسکتی ہے۔ اور قرآنی آیت:

وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِھَا ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ۔ (85:7)

تم زمین میں اس کے بعد کہ اس کی درستگی کردی گئی ہے فساد مت پھیلاؤ، اسی میں تمہارے لیے بہتری ہے اگر تم یقین رکھو۔''

خدا کی طرف سے انسانوں کے لیے ایک تنبیہ اور (Threat) کی حیثیت رکھتی ہے کہ وہ فطری اور پاکیزہ ماحول کو فساد اور تباہی سے بچائیں۔ اسی میں ان کی بھلائی ہے۔ نیز ایک جگہ فرمایا:

فَارْتَقِبْ یَوْمَ تَاْتِی السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِیْنٍ یَّغْشَی النَّاسَ ھٰذَا عَذَابٌ اَلِیْمٌ۔ (111:44)

اس دن کا انتظار کرو جب آسمان صاف اور نظر آنے والے دھوئیں کو لے کر آئے گا اور انسانوں پر چھا جائے گا۔ یہ تکلیف دہ عذاب ہوگا۔''

اگرچہ مفسرین نے اس آیت کو قیامت کے تناظر میں ذکر کیا ہے مگر یہ آیت موجودہ آلودگی کی صورتحال کے متعلق پیشین گوئی بھی ہوسکتی ہے جو ممکن ہے قیامت کا پیش خیمہ بن جائے۔

# ماحول سے واقفیت میں قرآن کا حصہ

ڈاکٹر سید ازکیا ہاشمی

انسان چونکہ ماحول سے متاثر بھی ہوتا ہے اور ماحول کو متاثر بھی کرتا ہے اس لیے اپنے ماحول سے واقفیت اس کے لیے از حد ضروری ہے قرآن حکیم کی متعدد آیات میں اہل ایمان کو اپنے ماحول سے واقفیت حاصل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ مثلاً ارشاد ربانی ہے: قُلِ انْظُرُوْا مَا ذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ (101:10) ''آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے اسے غور سے دیکھو۔'' قرآن حکیم کا ایک بڑا حصہ فطرت اور عناصر فطرت کے ذکر سے متعلق ہے، جو ایک مسلمان کو ان کی اہمیت اور افادیت سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان سے متعلق انسانی ذمہ داریوں کا احساس بھی دلاتا ہے۔ قرآن کائنات کو قدرت کے عظیم شاہکار کی حیثیت سے پیش کرتا ہے جو کہ فطرتی رعنائیوں اور حسن و جمال کا مرقع ہے وہ گھنے باغات، سرسبز و شاداب زمین، بہتے چشموں، پہاڑوں، دریاؤں، سمندروں، بادلوں، ہواؤں، چاند، سورج اور ستاروں کی طرف متوجہ کرتا ہے اور کائنات کی مختلف اشیاء کے سلسلہ میں انسان کی جمالیاتی حس کو تیز کرتا ہے خواہ ان کا تعلق بے جان اشیاء ہی سے ہو۔ وہ ہر قسم کی جاندار اور بے جان موجودات سے متعارف کرواتا ہے۔ حیوانات کے ضمن میں مختلف حیوانات اور جانداروں کی متعدد انواع و اقسام کی طرف اشارہ کرتا ہے اور ان کی افادیت کے مختلف پہلوؤں مثلاً سواری، دودھ، شہد، گوشت، شوکت و زینت، شکار اور دوا و علاج وغیرہ کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ وہ پرندوں کے خصوصی اشکال و اجسام اور ان خصوصی اعضاء کا تذکرہ کرتا ہے جو ان کے اڑنے میں معاونت کرتے ہیں۔ ان کے مرغوب گوشت اور لذیذ غذا کا ذکر کرتا ہے۔ وہ مختلف حشرات الارض کے رہن سہن کے طریقے اور ان کی عادات و اطوار کو بیان کرتا ہے کہ وہ کس طرح اپنے اعضاء اور صلاحیتوں سے کام لے کر اپنے مزاج اور ماحول کے مطابق اپنی زندگی کی حفاظت اور ضروریات زندگی کی تکمیل اور خطرات سے بچاؤ کا کام کرتے ہیں اور اپنے دقیق وظائف و اعمال کے ذریعے انسانوں کو بہت سے فوائد پہنچاتے ہیں۔ قرآن حکیم نے نباتات کا ذکر کرتے ہوئے (جو کہ انسانوں اور حیوانات کی اہم غذا ہے) ان میں زندگی کے وجود کی نشاندہی کی ہے اور بیج سے درخت تک کے تمام مراحل اور اس کے خشک ہونے کا ذکر کرتا ہے۔ وہ نباتات کی زندگی میں بیج، مٹی اور پانی کے ساتھ ساتھ ہواؤں کے اہم کردار کا بھی حوالہ دیتا ہے۔ اور ان میں نر و مادہ کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے جن کے باہم ملنے سے عمل بار آوری (Fertilization) مکمل ہوتا ہے۔ قرآن نباتات اور درختوں کے انواع و اقسام اور ان کے مختلف رنگوں اور شکلوں کی طرف متوجہ کرتے ہوئے ان کے فوائد و ثمرات کا بھی ذکر کرتا ہے جو کہ شجر کاری کے لیے اہم محرک ہیں۔

قرآن حکیم مختلف مقامات پر بارش کے پانی، نہروں اور دریاؤں کا ذکر کر کے آبپاشی کی اہمیت کو واضح کرتا ہے وہ پانی کے مختلف سرچشموں، بارش، دریاؤں، سمندروں اور زیر زمین میں پانی کا تذکرہ کرتا ہے اور زیر زمین پانی کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ وہ یہ بتلاتا ہے کہ انسانی، حیوانی اور نباتاتی زندگی کے لیے پانی کی کس قدر ضرورت ہے؟ وہ دریاؤں اور سمندروں سے وابستہ انسانی فوائد و منافع، مچھلیاں، ہیرے جواہرات، جہاز رانی اور تجارت وغیرہ کا تذکرہ بھی کرتا ہے۔ وہ ہواؤں کے نفع بخش اور ضرر رساں پہلوؤں کو بھی نمایاں کرتا ہے۔ قرآن پہاڑوں کی بلندی اور مضبوطی کے ساتھ ساتھ ان کی افادیت کے مختلف پہلوؤں مثلاً ان کے ذریعہ گرمی، آندھی اور انسانی حملوں سے بچاؤ کے لیے ان کی دفاعی اہمیت کا حوالہ دیتا ہے اور ان میں موجود معدنیات لوہے اور تانبے وغیرہ کی طرف بھی متوجہ کرتا ہے۔

ایک عمدہ اور مثالی ماحولیات کی تشکیل کے لیے ماحول اور فطرت سے آگاہی انسان کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ اس لیے قرآن نے اپنے ماننے والوں کے شعور کی بیداری اور فکری تربیت کا خصوصی اہتمام کیا ہے۔

## انسان اور فطرت

ماہرینِ ماحولیات اب یہ تسلیم کرنے لگے ہیں کہ ہماری ماحولیات کی تکلیف دہ صورتحال کا ایک بنیادی سبب یہ ہے کہ تمام اخلاقیات جواب تک زیر بحث رہی ہیں ان کے دائرۂ کار کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ محض انسان کے انسان سے تعلق سے بحث کرتی ہیں (نہ کہ کائنات اور فطرت سے انسانی تعلق کو) حالانکہ اصل مسئلہ انسان کے فطرت سے تعلق اور علیحدگی میں موجود ہے اور موجودہ صورتحال دراصل انسان اور فطرت کے درمیان عدم آہنگی اور حریفانہ مقابلے کا نتیجہ ہے۔ یہ بات کہ انسان اور فطرت کے درمیان ہم آہنگی بالکل ختم ہو چکی ہے اور جس کی تصدیق جدید تہذیب کے مختلف مظاہر سے ہوتی ہے اب مسلمہ حقیقت بن چکی ہے۔ فطرت پر انسانی تسلط نے جدید انسان کی نظر میں اسے غیر متبرک بنا دیا ہے اور اس کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ اسے زیادہ سے زیادہ استعمال کرتے ہوئے اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے۔ حسین نصر کے خیال میں فطرت، جدید انسان کی نظر میں ایک منکوحہ عورت ہونے کے بجائے (کہ جس سے انسان فائدہ اٹھاتے وقت خود کو ذمہ دار بھی محسوس کرتا ہے) ایک طوائف کی حیثیت اختیار کر چکی ہے، جس سے احسان مندی اور احساس ذمہ داری کے بغیر فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اور مشکل یہ ہے کہ عصمت دریدہ فطرت اب اس حال کو پہنچ چکی ہے کہ مزید لطف اٹھانا محال ہے۔ دراصل فطرت پر تسلط کا مروجہ تصور مذہبی نقطۂ نظر سے انسان کے اس مقام اور کردار کا غصب ہے کہ انسان فطرت کا نگہبان اور محافظ ہے۔

اسلامی تعلیمات فطرت کے احترام اور انسان اور فطرت کے درمیان وحدت وہم آہنگی کا تصور اجاگر کرتی ہیں اور ماحولیاتی تحفظ کے لیے ہمیں اپنے طرزِ حیات، مطمح نظر، اپنی ذات اور کائنات کے بارے میں تصور پر نظر ثانی کی تلقین کرتی ہیں۔ آئندہ سطور میں ہم انسانی تعلق کے حوالے سے فطرت کے مختلف پہلوؤں کا قرآن کی روشنی میں جائزہ لیں گے۔

(1) ماحولیاتی سیاق (Context) میں دیکھا جائے تو فطرت انسانوں کے لیے ایک خدائی ماڈل اور نمونہ ہے انسان فطرت کے ذریعہ خدا کا علم حاصل کرتا ہے اس لیے قرآن میں اسے ''آیت'' کہا گیا ہے۔ یعنی ایسی نشانیاں جن سے خدائی معرفت اور خدائی اسکیم (Divine Scheme) کا ہمیں علم ہوتا ہے۔ خدائی نشانیاں ہونے کے بناء پر نیز نفع بخش ہونے کی حیثیت سے وہ ہمارے لیے قابل احترام بھی ہیں اور خدائی نمونہ بھی مثلاً فطرتی دنیا میں درخت ایک عظیم کارخانہ کی صورت میں کام کرتے ہیں مگر دھواں نہیں بکھیرتے وہ اپنی کثافت کو آکسیجن کی صورت میں خارج کرتے ہیں اور پھول اپنی کثافت کو خوشبو کی صورت میں۔ فطرتی دنیا میں فضلات اور کوڑا دوبارہ استعمال ہونے کے لیے Recycle ہو کر گیسوں اور مختلف مفید اجزاء میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ زمین اپنے مدار میں چکر کاٹ رہی ہے مگر کسی قسم کی صوتی آلودگی (Noice Pollution) نہیں پیدا کر رہی ہے۔ سمندروں میں بے شمار جانور روزانہ مرتے ہیں مگر وہ پانی کو آلودہ نہیں کرتے۔ پتے درختوں سے گر کر ضائع نہیں ہوتے بلکہ کھاد میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہ مثالیں بتاتی ہیں کہ فطرت صالح ہے اور اسے فساد اور بگاڑ کسی شکل میں گوارا نہیں اسی لیے آیت قرآنی: وَلَا تُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ بَعۡدَ اِصۡلَاحِہَا، ذٰلِکُمۡ خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ۔ (7:85) میں زمین کو صلاح قرار دیتے ہوئے اس میں ہر قسم کے فساد بگاڑ سے منع کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ ''فساد''، ''صلاح'' کی ضد ہے۔ یہ تصور بہتر ماحول کی تشکیل کے لیے اہم محرک کی حیثیت رکھتا ہے اور ہمیں اپنے دائرۂ عمل واختیار میں Nature کی تقلید کرنے اور ماحولیات کو آلودگی اور تباہی سے بچانے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

(2) قرآن حکیم کی رو سے کائنات اور فطرت میں توازن، حسن، لطافت اور پاکیزگی کا عنصر پایا جاتا ہے۔ فطرت میں جس قدر انسانی مداخلت ہوتی ہے اسی تناسب سے اس کا توازن بگڑتا ہے اور اس کی رعنائی اور حسن متاثر ہوتا ہے۔ فطرت اور ماحول میں آلودگی اگر خود فطرتی عوامل کے نتیجے میں ہو تو اس کا سد باب بھی فطری طور پر ہوتا رہتا ہے مگر یہی آلودگی اگر غیر فطری عوامل یعنی انسانی مداخلت کے نتیجے میں پیدا ہو تو فطرت پر بوجھ اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ اس کا کوئی قدرتی حل ممکن نہیں رہتا۔ جدید انسان کی مصنوعیت پسندی نے آج اسے فطرت سے بے گانہ کر کے اس سے مستفید ہونے سے روک رکھا ہے۔ قرآن حکیم فطرت سے قریب تر زندگی کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اور انسان کے مصنوعی ماحول پر جو کہ شہریت پسندی کا شکار ہوتا ہے فطری ماحول کو ترجیح دیتا ہے۔ بنی اسرائیل کی صحرائی زندگی میں من وسلویٰ کے مقابلے میں مختلف سبزیوں اور ترکاریوں کے مطالبے کے جواب میں قرآن نے ان پر واضح کیا: ''اَتَسۡتَبۡدِلُوۡنَ الَّذِیۡ ہُوَ اَدۡنٰی بِالَّذِیۡ ہُوَ خَیۡرٌ۔'' (61:2) ''کیا تم اعلیٰ درجہ چیزوں کے مقابلے میں ادنیٰ درجہ کی چیزیں لیتے

ہو۔'' غذائی پیداوار (گندم اور اناج وغیرہ) کو ذخیرہ کرنے کے مختلف قدیم اور جدید طریقے اختیار کیے جاتے ہیں مگر قرآن حکیم میں حضرت یوسف علیہ السلام کی زبانی فطری ماحول کے ذریعہ غذا کی حفاظت اور ذخیرہ (Storage) کا مشورہ دیا گیا ہے تا کہ قحط سالی سے بچا جائے۔ (47:12) یعنی گندم کے دانوں کو اس کی بالوں میں محفوظ کرنے کا کیونکہ چھلکا بیرونی جراثیم کو دانے پر حملے سے روکتا ہے۔ اس طریقے کی صحت کو سائنسی سطح پر جانچنے کے لیے زرعی سائنسدانوں نے جو تجربات کیے ہیں ان سے اس طریقے کی افادیت کا ثبوت ملتا ہے۔ (15) قرآن کی نظر میں فطرت کے معتدل نظام میں مداخلت، خدا سے بغاوت اور شیطان کی پیروی ہے۔ قرآن کے نزدیک شیطان کی طرف سے یہ چیلنج دیا گیا تھا:

وَلَاٰمُرَنَّهُمۡ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلۡقَ اللّٰهِ‌ؕ وَمَنۡ يَّتَّخِذِ الشَّيۡطٰنَ وَلِيًّا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ فَقَدۡ خَسِرَ خُسۡرَانًا مُّبِيۡنًا ؕ (119:4)

''میں انہیں حکم دوں گا تو وہ خلق کو تبدیل کر دیں گے اور جو شیطان کو اپنا دوست بنائے گا اللہ کو چھوڑ کر تو اس نے کھلم کھلا نقصان اٹھایا۔''

جراثیم کش ادویہ (Perticides/ Insectricides) نشہ آور ادویہ اور غذاؤں میں کیمیکلز کا استعمال، آب و ہوا، زمین اور غذائی آلودگیاں دراصل خلق خدا کی تبدیلی کی مختلف شکلیں ہیں جو خدا سے بغاوت اور فطرت کے خلاف انسانی حملہ کی صورت میں ظاہر ہوئی ہیں۔

(3) قرآن حکیم فطرت کا ایک پہلو یہ بھی نمایاں کرتا ہے کہ وہ ''مسلم'' ہے وہ اللہ کی مشیت اور مرضی کی پابند اور اس کی اطاعت پر مجبور ہے۔ ''وَلَهٗۤ اَسۡلَمَ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ طَوۡعًا وَّكَرۡهًا۔'' (83:3) قرآن حکیم کی متعدد آیات بیان کرتی ہیں کہ کس طرح مختلف مخلوقات مسلم ہونے کی حیثیت سے اپنے مالک حقیقی کی تسبیح و عبادت میں مشغول اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ (18:22, 41, 24) فطرت کا خالق حقیقی کے سامنے سجدہ ریز اور مطیع ہونا ہے اس کا مسلم ہونا ہے۔ یہی اسلام و اطاعت انسان سے بھی مطلوب ہے تا کہ وہ بھی قوانین الٰہی کے پابند ہو کر بقیہ کائنات سے ہم آہنگ ہو جائیں۔ ورنہ حق (قانون الٰہی) کو چھوڑ کر خواہشات کی پیروی کا نتیجہ فساد اور تباہی و بربادی کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ ''وَلَوِ اتَّبَعَ الۡحَـقُّ اَهۡوَآءَهُمۡ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالۡاَرۡضُ وَمَنۡ فِيۡهِنَّ‌ؕ۔'' (71:23)

(4) ماحولیاتی بحث میں یہ نکتہ بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ انسان کو فطرت سے باہر یا ماوراء خیال نہ کرنا چاہیے۔ اسلامی تناظر میں انسان اور فطرت کے درمیان نا قابل انقطاع ربط و تعلق ہے۔ قرآن حکیم کی رو سے انسان فطرت کا جزو ہے اس کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے جو کہ ارضی مادہ ہے اس نے مرنے کے بعد زمین کا حصہ بننا ہے۔ اور اسی سے اس کی از سر نو پیدائش ہوگی۔ ''مِنۡهَا خَلَقۡنٰكُمۡ وَفِيۡهَا نُعِيۡدُكُمۡ وَمِنۡهَا نُخۡرِجُكُمۡ تَارَةً اُخۡرٰى۔'' (55:20) قرآن کی رو سے زمین انسان کے لیے گہوارہ (مہد) بچھونا (فرش) اور رزق کا وسیلہ ہے۔ کائنات کے مختلف عناصر ہوا، پانی، مٹی، حرارت اور روشنی وغیرہ انسانی زندگی کا جزو لاینفک ہیں اور اس کے تمام اجزاء وعناصر ایک دوسرے سے مربوط اور ایک دوسرے پر منحصر ہیں، اسی لیے انسان کا یہ فرض ہے کہ وہ اس کے مختلف اجزاء اور مخلوقات کے لیے احترام، ذمہ داری اور بھلائی کا رویہ اختیار کرے ان کی تذلیل و استحصال خود انسانیت کی تذلیل و استحصال، ان کا احترام خود انسانیت کا احترام اور ان کے تحفظ خود انسانیت اور زندگی کا تحفظ ہے۔ پیغمبر اسلام نے ساری زمین کے مسجد اور پاکیزہ ہونے کا تصور دے کر ماحولیاتی تحفظ کا اہم محرک دیا ہے۔ یہ تصور زمین کے متعلق احترام کا تصور بھی بیدار کرتا ہے۔ فطرت کے ساتھ انسان کے تعلق کے یہ پہلو ایک ماحولیاتی ضابطہ اخلاق کی تشکیل میں انتہائی معاون ثابت ہو سکتے ہیں جن کی طرف اسلام نے ہماری رہنمائی کی ہے۔

فطرت کے متعلق مسلمانوں کا جذبہ احترام اس قدر گہرا ہے کہ حسین نصر کے خیال میں اسلام میں ٹیکنالوجی کے ارتقاء کو بالا رادہ دبا دیا گیا جب ٹیکنالوجی طبعی ماحول کے لیے خطرہ بن گئی۔

> "The Development of technology under Islam in the Middle Ages came to an end because of the awarness of Muslims that there was a threat to the natural environment. They respected the nature so much that they deliberately stopped technological davancement."[16]

## فطرت اور قدرتی وسائل کا تحفظ

ماحولیاتی تباہی کا ایک اہم سبب قدرتی وسائل کا ضیاع ہے جس نے فطرت میں موجود توازن کو متاثر کر دیا ہے۔ اس بارے میں قرآن کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ زمین اور اس میں موجود اشیاء انسان کے لیے خدا نے پیدا کی ہیں

تا کہ وہ ان سے فائدہ اٹھائے اور انہیں استعمال کرے۔(29:2) اور خدا نے کائنات کو انسان کے لیے مسخر کر دیا ہے۔(14:33-32) مگر یہ تسخیر مغرب کے مادہ پرستانہ تصور سے قطعی مختلف ہے جو کائنات کی مختلف قوتوں سے استفادہ اور ان کے استعمال کا طریقہ وحی سے نہیں بلکہ عقل سے متعین کرتا ہے۔ جب کہ اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق انسان کو ان اشیاء پر اختیار اور ان کے استعمال و استفادہ کی اجازت اس شرط کے ساتھ دی گئی ہے کہ وہ خدائی قوانین اور صحیح طریقے کے مطابق ہو کیونکہ وہ زمین پر خدا کا خلیفہ اور نائب ہے یہ نقطۂ نظر کہ تسخیر کا تصور فطرت کے غلط استعمال کے لیے ایک نظریاتی بنیاد فراہم کرتا ہے درست نہیں، تسخیر کے تصور کو قرآنی سیاق میں دیکھا جائے تو اس سے ہرگز فطرت کے استحصال کا راستہ ہموار نہیں ہوتا بلکہ فطرت کے تحفظ کی بنیاد فراہم ہوتی ہے۔

اسلام کے نزدیک تمام قدرتی وسائل انسان کو امانت کے طور پر عطا کیے گئے ہیں اور یہ وسائل سب کے لیے ہیں ان کا استعمال تمام مخلوقات کے نفع کے لیے ہونا چاہیے۔ یہ وسائل کسی ایک زمانے کے انسانوں کے لیے نہیں۔ انہیں باقی اور برقرار رکھنا بھی انسان کے فرائض میں داخل ہے۔ ان کا استعمال واستحصال اس شکل میں نہ ہونا چاہیے کہ وہ آئندہ زمانوں اور نسلوں کے لیے باقی نہ رہیں انسان کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنے قدرتی وسائل کو تباہ کر کے فطری ماحول کو غیر متوازن بنائے بلکہ ان نعمتوں کو مزید فروغ اور ترقی دے کر زمین کی زینت و آرائش میں اضافہ کا باعث بنے۔ اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ زمین پر انسانی ضروریات کی تکمیل کے لیے جو قدرتی ذخائر موجود ہیں اور جن کے پیدا کرنے میں کسی شخص کی محنت کا کوئی دخل نہیں وہ سب کے لیے ہیں اور تمام انسان ان سے فائدہ اٹھانے کا استحقاق رکھتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

اَلْمُسْلِمُوْنَ شُرَكَاءُ فِي ثَلَاثٍ فِي الْمَاءِ وَالْكَلَاءِ وَالنَّارِ۔ [17]

''لوگ تین چیزوں میں ایک دوسرے کے شریک ہیں پانی، گھاس اور آگ۔''

آگ کے ضمن میں تیل اور گیسیں بھی داخل ہیں جو آج کا ایندھن ہیں۔ ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک شخص کے مطالبے پر نمک کی کان اسے عطا کی مگر پھر اس سے واپس لے کر عوام کے فائدے کے لیے وقف کر دی۔ [18]

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جن وسائل حیات سے عام لوگوں کا مفاد وابستہ ہے ریاست کو بھی یہ اختیار نہیں کہ وہ انہیں کسی ایک فرد یا ایک جماعت کی ملکیت میں دے کر دوسروں کو ان کے فوائد سے محروم کر دے۔

اہم قدرتی وسائل میں پانی، ہوا، زمین، جنگلات، جنگلی و آبی حیات خاص طور پر داخل ہیں اور اسلام نے ان کے تحفظ و بقاء کے لیے خصوصی ہدایات دی ہیں جن سے اسلام کے ماحولیاتی نقطۂ نظر کی وضاحت ہوتی ہے۔ اور جن کی روشنی میں موجودہ ماحولیاتی بحران اور اس سے متعلقہ مسائل پر قابو پانا ممکن ہے۔ آئندہ سطور میں ان تعلیمات کا اجمالی خاکہ پیش کیا جا رہا ہے۔

پانی زندگی کی بنیاد ہے اس لیے اسلامی شریعت میں اس کے استعمال میں اسراف کی ممانعت ہے حتیٰ کہ بہتے دریا سے وضو کرتے وقت بھی پانی کے ضرورت سے زائد استعمال سے اللہ کے رسول ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ قرآن کی نظر میں صاف پانی کی اتنی اہمیت ہے کہ وہ پانی کا ذکر کرتے ہوئے ہر جگہ اس کے خالص اور پاک صاف ہونے کو نمایاں کرتا ہے۔ فقہاء نے صاف پانی کی شناخت کا یہ شرعی اصول بتلایا ہے کہ جس کا رنگ، بو اور ذائقہ متغیر نہ ہو۔ پانی کو آلودگی سے پاک رکھنے کے لیے اللہ کے رسول ﷺ نے کھڑے پانی یا حوضوں کے کناروں پر غلاظت پھینکنے اور پیشاب پاخانہ کرنے سے منع فرمایا ہے۔ پانی وغیرہ مشروبات پیتے وقت برتن میں سانس لینے اور اس میں پھونکنے سے منع فرمایا ہے۔ (تا کہ کاربن اور جراثیم وغیرہ سے آلودہ نہ ہو)۔ پانی کے برتنوں اور کھانے پینے کے اشیاء کو ڈھانپ کر رکھنے کی ہدایت کی ہے۔ ان تعلیمات کی روشنی میں ندی، نالوں کے پانی کو پیشاب پاخانہ سے آلودہ کرنے اور صنعتی کیمیائی مائعات کو دریاؤں میں بہا کر بالخصوص آبی مخلوق اور زرعی فصلوں کو نقصان پہنچانے اور زمین کو آلودہ کرنے کا فعل کتنا بڑا گناہ اور جرم متصور ہوگا؟

فضائی آلودگی سے تحفظ اور ہوا کی پاکیزگی کے لیے شریعت نے بدبودار چیزوں کے استعمال کی ممانعت کی ہے (جس میں سگریٹ نوشی بھی شامل ہے)۔ منہ کی بدبو سے ہوا کو آلودہ ہونے سے بچانے کے لیے مسواک کی تاکید و ترغیب ہے۔ جمائی کی صورت میں منہ پر ہاتھ رکھنے کی ہدایت ہے۔ مساجد (اور پبلک مقامات) میں مولی، کچا لہسن، اور پیاز کھا کر آنے اور اخراج ریح کی ممانعت ہے۔ پبلک مقامات، سایہ دار درختوں کے کنارے پیشاب پاخانہ کے ذریعہ فضا کو متعفن کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ پسینہ کی بدبو سے بچانے کے لیے صاف لباس پہننے، خوشبو لگانے اور نہانے کی ہدایت کی گئی ہے۔ گندگی اور کوڑا کرکٹ گھروں میں جمع کرنے سے منع کیا گیا ہے اور انہیں پاک صاف رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

ہوا کی صفائی کا اہم منصوبہ ''شجر کاری'' ہے۔ قرآن نے درختوں کی افادیت کے مختلف پہلوؤں کا ذکر کیا ہے۔ درختوں اور جنگلات کا تحفظ درحقیقت زندگی کا تحفظ ہے۔ اس لیے جنگلات کی بے دریغ کٹائی انسانیت کے قتل کے مترادف ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے درخت لگانے کو صدقہ

جاریہ قرار دیا ہے اور اس بارے میں اس حد تک تاکید کی ہے کہ اگر قیامت قائم ہونے لگی ہو اور کسی کے ہاتھ میں کاشت کرنے کے لیے پودا ہو تو اسے ضرور لگائے۔ جو شخص اپنی زمین کو قصداً تین سال تک غیر آباد اور غیر مزروع رکھے حکومت اسے ایسے شخص کے سپرد کر سکتی ہے جو اسے آباد کر سکے۔ جنگلات کی افزائش اور تحفظ کے لیے اللہ کے رسول ﷺ نے مدینہ کے ارد گرد بارہ میل کی حدود کا علاقہ اور طائف کے علاوہ ''وج'' کو حرم اور ''حمی'' (Protected Zone) قرار دے کر اس میں خودرو درخت کاٹنے اور شکار کھیلنے پر پابندی عائد کی اور اس پر سزا مقرر کی۔ اس سے جنگلات اور جنگلی حیات کے تحفظ کے لیے نیشنل پارک یا Protected Zone قائم کرنے کی بنیاد ملتی ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے خود اپنے ہاتھوں سے پودے لگائے اور خلفائے راشدین نے اس سنت کو جاری رکھا۔ اس طرح مسلمانوں کے ہاں شجر کاری ایک دینی فریضہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

جنگلی و آبی حیات کا تحفظ بھی انسانی فرائض میں شامل ہے۔ قرآن حکیم کی رو سے زمین اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کے لیے بنائی ہے۔ وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ۔ (10:55) اس لیے کسی بھی زندہ وجود کو بغیر کسی وجہ کے زندگی کے استحقاق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ طوفان نوح کے وقت حضرت نوح علیہ السلام کو (نسل کے تحفظ کے لیے) تمام جاندار اشیاء کے جوڑے اپنی کشتی میں رکھنے کی ہدایت کی گئی۔ مفید حیوانات کی پرورش اور ان کی نسلی ترقی کے لیے حضور نے کئی ایک ہدایات دی ہیں۔ آپؐ نے حیوانات کو ایذاء پہنچانے، مارنے، زیادہ مشقت لینے اور انہیں بھوکا پیاسا رکھنے سے منع فرمایا۔ ایک پیاسے کتے کو پانی پلانے پر مغفرت اور ایک بلی کو پیاسا مارنے پر جہنم کی وعید سنائی۔ ان تعلیمات کی روشنی میں کیا جانوروں کو قدرت کی طرف سے عطا کردہ ماحول تباہ کر کے انہیں آب و دانہ سے محروم رکھنا ظلم نہ ہوگا؟ اللہ کے رسولؐ نے پرندوں کے بے جا قتل اور شوقیہ شکار کی ممانعت فرمائی۔ شریعت اسلامی میں شکار جائز ہے مگر ضرورت کے تحت اور ظلم کے بغیر۔ قرآن کی رو سے اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز بھی بے فائدہ پیدا نہیں کی۔ مختلف پرندے فصلوں اور درختوں کو نقصان پہنچانے والے کیڑے مکوڑوں کو ختم کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اس لیے ان کا بے جا قتل نہ صرف ان کے ساتھ ظلم ہے بلکہ خود اپنے ساتھ بھی۔ مچھلی کے شکار کے سلسلے میں بے احتیاطیاں اور ان کی نسل کشی، کیمیائی مائعات اور ایٹمی فضلہ سے آبی حیات کی تباہی ان تعلیمات کی روشنی میں بہت بڑا جرم ہے۔

اس مقالے میں اسلام کے ماحولیاتی نقطۂ نظر کے چند پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ قرآن و حدیث میں مختلف ماحولیاتی مسائل کے حل کے لیے تفصیلی رہنمائی موجود ہے۔ آخر میں یاد دہانی کے لیے ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر موجودہ صورتحال کو درست کرنا ہے تو یہ ناگزیر ہے کہ خلوص دل اور عزم صمیم کے ساتھ اسلام کے ماحولیاتی نقطۂ نظر کی جانب پیش رفت کی جائے تاکہ شریعت کے احکامات کی روشنی میں آلودگی، وسائل کے تحفظ اور شہروں سے آبادی کے ارتکاز کے سلسلے میں قانون سازی کرنے، مغرب کے طرزِ عمل کو ترک کرنے اور ماحولیاتی اعتبار سے بیدار اسلامی روایات اور طرزِ حیات کی جانب واپس ہونے کی راہ ہموار ہو سکے۔

## حواشی و تعلیقات


(1) John. F. Haught: Science and Religion: from Conflict to Conversation (New York: Paulist Press, 1995) p. 183
(2) Ibid. pp 183-215
(3) S.N. Nasr: "Sacred Science". p. 134
(4) See. Russel Train, "Vital Speaches of the Day" 1990, pp. 664-65 John passmor, "Man's responsibility for Nature" (New York, Scribner, 1974). p. 184 Liynn White: "The Historical Roots of Our Ecological Crises, Science", Vol. 155, p. 1203-1207
(5) John. F. Haught: Science and Religion. p. 186
(6) See, Lynn White: "The Historical Roots of Our Ecological Crises". p. 1203-2007
(7) See, John. F. Haught: "Science and Religion". p. 187
(8) S.H.Nasr. "Sacred Science"., p. 134
(9) See, "Man Does not Stand Alone", p. 123
بحوالہ مذہب اور جدید چیلنج، وحیدالدین خاں، دارالتذکیر (س۔ن) ص 222
(10) ایضاً, p. 207
(11) John. F. Haught: "Science and Religion". p. 189
(12) I.G. Simmons, "Interpreting Natural", "Cultural Construction of the Environment"; London & New York, Routledge, 1993), p. 1333
(13) John. F. Haught: "Science and Religion". p. 187
(14) S.P. Manzoor, "Environment and Values" in Z. Sardar, ed., The Touch of Midas: Sceince, value and the enviornment in Islam and the West." (Manchester: University of Manchester Press, 1984), p. 153
(15) F.H. Shah, W.H. Shah, T.Kausar & M. Yasin, Pak, Jr. Sci. ind 3 2, 471 (1989)
(16) S.H.Nasr. "Man and Nature: The Spirtual Crises of the Modern Man", (London: Unwin. Paperbakcs, 1990, 1968), p. 92.
(17) سنن ابن ماجہ، کتاب البیوع، باب فی منع الماء
(18) ترمذی: جامع ترمذی، باب ماجاء فی القطائع



**PROF DR SHAH MOHYUDDIN HASHMI**
Dean Deptt of Islamic Thought
Allama Iqbal Open University
Islamabad, Pakistan

**DR SAYED AZKIYA HASHMI**
Assistant Professor
Deptt of Islamic Studies
Gov. Post Graduate College
Mansehra, Pakistan

# ماحولیاتی بحران
## مشترکہ جدوجہد کی ضرورت

ڈاکٹر عبدالرشید اغوان

ماحولیاتی بحران عصر حاضر کا سب سے بڑا بحران ہے۔اس کی اہمیت اتنی ہی زیادہ ہے جتنی کے خود انسان کا وجود اور اس کرہ ارض پر دیگر مخلوقات کی بقاء اہم ہے۔دنیا کی اکثر حکومتیں اس بحران سے نمٹنے کے لیے سرگرم عمل ہیں۔عوام اس وجہ سے فکر مند ہیں کہ ماحولیاتی بحران کے نتیجے میں انہیں طرح طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔مثلاً میٹرو پولیٹن شہروں میں مہلک آلودگی کا غلبہ، آبی چکر کی تحلیل، پینے کے پانی کی قلت، مٹی کی زرخیزی میں کمی، سطح سمندر میں اضافہ، متعدد انواع کا ناپید ہو جانا، کوڑا کرکٹ کے سلسلے میں بدانتظامی وغیرہ۔گزشتہ چند صدیوں میں صنعتی انقلاب اور انسانی آبادی میں بے پناہ اضافے کے بعد یہ تبدیلیاں بتدریج رونما ہوئی ہیں۔مختلف صنعتوں میں ابتداء میں مقامی سطح پر پھر بعد میں عالمی پیمانے پر آلودگی میں اضافہ کرنے میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔جنگلات کی بے تحاشہ کٹائی بھی آلودگی میں اضافے کا باعث بنی کیوں کہ کرہ ارض پر جنگلات اور درختوں کی شکل میں موجود 'سبز چادر' کاربن جذب کر کے آلودگی میں کمی لا سکتی تھی۔ آلودگی کے سبب گرین ہاؤس اثرات اور اوزون کی کمی کی وجہ سے زمین گرم ہو رہی ہے۔زمین کی تپش میں اضافہ ہونے کی وجہ سے آبی چکر اور ماحولیاتی نظام کی تحلیل، قطبی اور گلیشیئر کے برف کا تیزی سے پگھلنا، مٹی کی زرخیزی میں کمی، نت نئے وبائی امراض اور آلودگی کی وجہ سے ہونے والی اموات میں اضافہ، مختلف انواع کا ناپید ہو جانا، وغیرہ مسائل سامنے ہیں۔ناقابل تحلیل اشیاء مثلاً پلاسٹک وغیرہ کے حد سے زیادہ استعمال نے دنیا کے بڑے شہروں میں کوڑا کرکٹ کو کنارے لگانے میں چیلنج پیش کیا ہے۔ان تمام مسائل کے لیے ماحولیات سے متعلق صحیح پالیسیوں کو اختیار کرنے اور مناسب اقدامات کی ضرورت ہے۔اس کے علاوہ اس مہم میں عوام کی بیدار شرکت کی بھی ضرورت ہے کیوں کہ ماحولیاتی بحران کے لیے بڑی حد تک مفاد پرست اور ہوس پرست کلچر بھی ذمہ دار ہے۔

اگرچہ کہ آلودگی اب ایک زبان زد عام لفظ بن چکا ہے، لیکن اس کے خاتمے کے لیے جو لوگ سنجیدہ ہیں ان کی تعداد اب بھی ناقابل ذکر ہی ہے۔اس کی تین بنیادی وجوہات ہیں۔اول، عام طور پر لوگ ماحول کو ایک تکنیکی میدان سمجھتے ہیں جہاں صرف اس میدان کے ماہرین ہی کوئی کردار ادا کر سکتے ہیں۔دوم، لوگ ماحولیاتی اصلاحات کو حکومت کی ذمہ داری سمجھتے

ہیں۔سوم،لوگوں کولگتا ہے کہ وہ پہلے سے ہی بعض دیگر مسائل کے تلے دبے ہوئے ہیں۔ایسے مسائل جوان کی سماجی معاملات کی ترجیح کو طے کرتے ہیں۔مثلاانتخابی سیاست،سماجی اتحاد،معاشی ترقی،تعلیمی ترقی اور مذہبی فرائض وغیرہ۔ماحولیاتی موضوعات شاذ ونادرہی ان کی ترجیح میں شامل ہوتے ہیں۔

سب سے پہلے ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ ماحول ہمارے بڑے گھر کی مانند ہے۔جیسے ہم اپنے گھر کی دیکھ بھال کرنے پر اپنے آپ کو مجبور محسوس ہیں، ماحولیاتی گھر بھی اپنی صحت اور بقاء کے لیے اسی طرح کی دیکھ بھال کا تقاضا کرتا ہے۔ہہمارے پاس ایک مناسب گھر کے علاوہ کوئی جگہ نہیں ہے،اسی طرح مناسب وموافق آب وہوا کے بغیر ہم اپنے کسی مستقبل کا تصور نہیں کر سکتے۔ماحول ہمارے گردوپیش کی اشیاء کاایک مجموعہ ہے۔مثلاً مٹی،کھیت، جانور،درخت،ہوا،نہریں چشمے،توانائی کے ذرائع،ذرائع آمدورفت،بارش، پہاڑ اورسب سے اہم،انسان۔ایک صحت مند ماحول ہی ایک صحت مند زندگی کی نشو ونما کرتا ہے۔جب کہ آلودہ اور مسائل سے بھرپور ماحول،زندگی میں تناؤ کا سبب بنتا ہے۔ماحول اور ماحولیاتی نظام پر دسترس رکھنے ولے ماہرین کے مقابلے میں ماحول سے وابستہ ہماری روزمرہ کی زندگی ہمیں اپنے ماحول کو بہتر طور پر سمجھنے میں زیادہ مددگار ہوتی ہے۔ماہرین ہمیں حقائق،اعمال اور ماحول کے بارے میں مہین سے مہین معلومات فراہم کرتے ہیں لیکن،چوں کہ ہم خود ماحول کا حصہ ہیں،ہم اپنی زندگی کے اکثر اوقات میں ماحول کا سامنا کرتے ہیں اوراسے قریب سے محسوس کرتے ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے آبائی وطن کو آپ راجدھانی میں بیٹھے کسی ماہر سے زیادہ بہتر جانتے ہیں۔کئی پہلوؤں سے مقامی افراد ماحول کے بارے میں تکنیکی ماہرین کے مقابلے میں زیادہ گہرے جذبات رکھتے ہیں۔ماحول کے تکنیکی پہلوؤں سے واقف ہونے کے لیے ماہرین کی ضرورت ہوتی ہے۔لیکن ماحولیات تنہا ان ہی کا میدان نہیں ہے۔یہ صحیح ہے کہ ماحول اوراس کے ماحولیاتی نظام کا تحفظ حکومت کی ذمہ داری ہے۔لیکن ماحولیاتی مسائل کی سنگینی کے پیش نظر،حکومتیں اپنے کام میں عوام کے سرگرم تعاون کے بغیر کامیاب نہیں ہوسکتی ہے۔حقیقت یہ بھی ہے کہ کوئی بھی حکومت دراصل عوام ہی کی امیدوں کا عکس ہوتی ہے۔اگر عوام ماحولیاتی مسائل کے تئیں بیدار،سنجیدہ اور مستعد ہیں تو لازمی طور پر ان مسائل کو حل کرنے والی اتنی ہی حساس حکومت کا انتخاب عمل میں آئے گا۔اب یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ ماحولیاتی بحران کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مختلف مسائل کا شکار ہوکر بڑی تعداد میں انسان ہلاک ہورہے ہیں،ہر سال 60لاکھ سے زیادہ۔ماحولیاتی نظام کو نقصان پہنچانے والے طرز زندگی کے سبب آج مختلف قسم کے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ان سب کے باوجود ماحولیاتی اصلاح کا موضوع شاید ہی کبھی سیاسی ڈسکورس کا حصہ بن پاتا ہے۔ہمارے پاس ذات پات،مذہب،عبادت خانوں اورانصاف کو لے کرسیاست کرنے کا وقت ہے لیکن ماحولیاتی اصلاح کے تناظر میں کوئی سیاسی جدوجہد نہیں ہے۔

یہ صحیح ہے کہ لوگ تعلیم،معاشی صورت حال،صحت،عوامی سہولیات اور اس قسم کے زندگی کے دوسرے مسائل پر گفتگو کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔حالاں کہ ماحولیات کی بقاءاورانسان کے وجود سے متعلق مسائل کو مکمل طور پور عام عوامی بحثوں کا حصہ بننا چاہیے۔اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ ماحولیاتی بحران ہی ہمارے آج کے بہت سے مسائل کی جڑ ہے۔ماحولیاتی بحران حصول تعلیم،معاشی بہبود،صحت عامہ،غذا کی فراہمی،جی ڈی پی اور سب سے اہم،زمین پر زندگی کے وجود کو متاثر کرتا ہے۔چوں کہ زیادہ تر مذہبی تعلیمات بھی ماحول کی پاکیزگی اور پاکیزگی کو برقرار رکھنے والے نظام پر زور دیتی ہیں،اس لیے ماحولیاتی اصلاح کے لیے سرگرم عمل ہونا،یہ ایک مذہبی فریضہ بھی بن جاتا ہے۔خاص طور پر اسلام ایک ماحولیاتی طور پر صحت مند سماج کے لیے جامع اصول متعین کرتا ہے۔یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ اکثر ماحولیاتی مسائل انسان کی بےلگام طرز زندگی کا نتیجہ ہیں،اور یہ صرف عوام ہی ہیں جو اپنے طرز زندگی میں بہتر تبدیلی لاکر ماحول کے تحفظ اور بقاء کو یقینی بنا سکتے ہیں۔

درج بالا امور کے پیش نظر،یہ وقت کی پکار ہے کہ ناگزیر ماحولیاتی اصلاحات کے مقصد کے تحت بیداری،تعلیم،اور سرگرمی کے لیے جامع تعاؤن باہمی کا کو یقینی بنایا جائے۔اس کے بغیر زندگی کی بقاء ہمیشہ خطرے میں رہے گی۔یہ محسوس کیا جانا چاہیے کہ ماحولیاتی مسائل مثلاً آب وہوا میں تبدیلی، آلودگی،کاربن کا اخراج،انواع کا ناپید ہونا،آبی ذرائع کا سکڑنا،بارش کی غیر یقینی صورت حال،ٹھوس کوڑے کرکٹ کو کنارے لگانا وغیرہ مسائل کا حل، حکومت اور عوام دونوں مل کر ہی نکال سکتے ہیں۔اس کے لیے عوام کی بیداری اور حکومت کی ذمہ داریاں بہت اہم ہیں۔سماجی اور سیاسی ڈسکورس میں ماحولیاتی بحران کو زیر بحث لاکر حکومت کی ذمہ داریوں کو متعین اور یقینی بنایا جاسکتا ہے۔حکومت اور عوام کے مابین ماحولیات کے تئیں سرگرم افراد کا اہم کردار ہونا چاہیے۔ایک طرف وہ عوام میں بیداری لاسکیں تو دوسری طرف متعلقہ مسائل پر حکومت کے ساتھ تال میل پیدا کرسکیں۔گو کہ ہمارے سماج میں ایسے سرگرم افراد کی تعداد انتہائی کم ہے،لیکن موجودہ صورت حال میں اصلاحات کے لیے ہر جگہ ان کی متاثر کن سرگرمی ہی ایک واحد طریقہ ہے۔اس لیے ماحولیات کے لیے سرگرم افراد کو حتی الامکان اثر دار طریقے سے یکجا کرنے،ان کی تربیت کرنے اور انہیں منظم کرنے کی ضرورت ہے۔

**DR ABDUL RASHID AGWAN**
President, Institute of Policy Studies
Writer "Islam And The Environment"
New Delhi
Phone: 9718506980

فکر

# قصہ آدم

تحریر: پروفیسر مستنصر میر
انگریزی سے ترجمہ: سعود فیروز احمد

## (بقرہ، سورہ نمبر 02، آیات 30 تا 39، آیات کا ترجمہ: امین احسن اصلاحیؒ)

**آیت 30:** ''اور یاد کرو جب کہ تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں، انہوں نے کہا کیا تو اس میں اس کو خلیفہ مقرر کرے گا جو اس میں فساد مچائے اور خوں ریزی کرے اور ہم تو تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح کرتے ہی ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے ہی ہیں؟ اس نے کہا میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔''

**آیت 31:** ''اور اس نے سکھا دیے آدم کو سارے نام، پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اگر تم سچے ہو تو مجھے ان لوگوں کے ناموں سے آگاہ کرو۔''

**آیت 32:** ''انہوں نے کہا کہ تو پاک ہے، ہمیں تو تو نے جو کچھ بتایا ہے اس کے سوا کوئی علم نہیں۔ بے شک تو ہی علم والا اور حکمت والا ہے۔''

**آیت 33:** ''کہا اے آدم! ان کو بتا ان لوگوں کے نام تو جب اس نے بتائے ان کو ان لوگوں کے نام تو اس نے کہا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ آسمانوں اور زمین کے بھید میں ہی جانتا ہوں اور میں جانتا ہوں اس چیز کو جس کو تم ظاہر کرتے ہو اور جس کو تم چھپاتے ہو''

**آیت 34:** ''اور یاد کرو جب کہ ہم نے کہا فرشتوں سے کہ آدم کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے۔ اس نے انکار کیا اور گھمنڈ کیا اور کافروں میں سے بن گیا''۔

**آیت 35:** ''اور ہم نے کہا اے آدم، تم اور تمہاری بیوی دونوں رہو جنت میں اور اس میں سے کھاؤ فراغت کے ساتھ جہاں سے چاہو اور اس درخت کے پاس نہ پھٹکنا ورنہ ظالموں میں سے بن جاؤ گے''۔

**آیت 36:** ''تو شیطان نے ان کو وہاں سے پھسلا دیا اور ان کو نکلوا چھوڑا اس عیش و آرام سے جس میں وہ تھے۔ اور ہم نے کہا اتر و تم ایک دوسرے

کے دشمن ہو گے اور تمہارے لئے ایک وقت خاص تک زمین میں رہنا بسنا اور کھانا پینا ہے''

**آیت 37:** ''پھر آدم نے پا لیے اپنے رب کی طرف سے چند کلمات تو اس نے اس کی توبہ قبول کی۔ بے شک وہی توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے''

**آیت 38:** ''ہم نے کہا اترو یہاں سے سب، تو اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے تو ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگیں ہوں گے''۔

**آیت 39:** ''اور جو کفر کریں گے اور جھٹلائیں گے میری آیتوں کو وہی لوگ دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے''۔

## تعارف

یہ عبارت دو مجموعہ آیات، 30 تا 33 اور 34 تا 39، پر مشتمل ہے۔ آیات کا پہلا مجموعہ اللہ کے زمین میں اپنا نائب مقرر کرنے کے فیصلے اور اس فیصلے پر فرشتوں کے ردعمل سے متعلق ہے۔ دوسرا مجموعہ خدا کے آدم اور ان کی بیوی (جن کا نام قرآن میں کہیں ذکر نہیں ہوا ہے، تاہم بائبل سے ماخوذ ان کا نام 'حوا' مسلم علماء میں مستعمل ہے) کو جنت میں رکھنے، اور ایک مخصوص درخت کا پھل کھانے کی ممانعت سے متعلق ہے۔ ان دونوں مجموعہ آیات میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں وہ باہمی تعلق رکھتے ہیں۔

## تفسیر

**آیت 30:** اللہ تعالی فرشتوں کے مابین اعلان کرتا ہے کہ وہ زمین میں اپنا خلیفہ (خلیفہ عربی لفظ ہے، جس کے معنی نائب اور نمائندہ کے ہوتے ہیں) مقرر کرنے جا رہا ہے۔ اگرچہ کہ اللہ تعالی نے ابھی صراحت نہیں کی تھی کہ وہ کسے خلیفہ مقرر کرنے والا ہے، لیکن فرشتوں نے قیاس کر لیا کہ یہ خلیفہ فرشتوں میں سے نہیں ہوگا۔ جیسا کہ ہمیں اس عبارت اور قرآن کی دوسری عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی اسکیم میں جو خلیفہ ہے اس کا نام آدم ہے، جس کا تعلق ایک ایسی نوع نوع انساں سے ہے جسے عنقریب معرض وجود میں لایا جائے گا۔ لغوی معنی کے اعتبار سے، خلیفہ وہ ہے جسے چند اختیارات سونپے جائیں، اور اسے ان اختیارات کے استعمال میں کسی حد تک آزادی بھی حاصل ہوگی۔ فرشتوں نے، جنہیں قرآن ایک باشعور مخلوق کے طور پر پیش کرتا ہے، ایک ایسے بااختیار خلیفہ کی ضرورت پر اظہار حیرت کیا ہوگا۔ کیوں کہ انہوں نے سوچا ہوگا کہ خلیفہ کی جانب سے اسے حاصل اختیارات کو غیر دانشمندانہ طریقے سے استعمال کرنا، شر اور فساد کا موجب ہو سکتا ہے۔ لیکن خدا، جو سراسر سرچشمہ خیر ہے، شر اور فساد کے وجود کو کیسے گوارا کر سکتا ہے؟ فرشتے سمجھ چکے تھے کہ ایک نئی مخلوق کو وجود میں لانے کا باعث صرف یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اللہ تعالی کی حمد وثناء بیان کرے۔ کیوں کہ یہ تو وہ فرض ہے جسے وہ پہلے سے ہی بخوبی ادا کر رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے طے کیا کہ اللہ تعالی سے خلیفہ کے تقرر کی معقولیت دریافت کریں گے۔ اپنے تجسس کو 'معاملہ فہمی' کے پردے میں چھپاتے ہوئے، فرشتوں نے اس شر پر زیادہ زور دیا جو فرشتے کے اپنے اختیارات غلط طور پر استعمال کرنے کے نتیجہ میں پیدا ہو سکتا ہے: ''انہوں نے کہا کیا تو اس میں اس کو خلیفہ مقرر کرے گا جو اس میں فساد مچائے اور خوں ریزی کرے؟'' اللہ تعالی نے فرشتوں کے سوال کا براہ راست جواب نہیں دیا۔ یہ کہہ کر کہ ''میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے'' اس نے ایک ایسا جواب دیا جسے جواب دینے کا ایک ڈرامائی اسلوب کہا جا سکتا ہے۔

**آیت 31:** اللہ تعالی آدم کو 'سارے نام'' سکھاتا ہے۔ پھر وہ ''انہیں'' - انہیں سے مراد وہ سارے نام نہیں ہیں بلکہ، عربی ضمیر ھُم ان ذی روح افراد کی طرف اشارہ کرتی ہے جن کے یہ نام ہیں، فرشتوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اور فرشتوں سے کہتا ہے کہ ''اِن کا'' نام بتائیں۔ یہاں بھی ضمیر اشارہ 'ھٰؤلاء' جانداروں پر دلالت کرتی ہے۔ ''اگر تم سچے ہو'' یعنی اگر فرشتے اپنے اس خیال میں صائب ہیں کہ خلیفہ کا تقرر محض فساد فی الارض کا موجب ہوگا۔ اس فقرہ میں اس بات کا واضح اشارہ موجود ہے کہ فرشتے غلط فہمی کا شکار ہیں۔ تاہم اگر وہ غلط فہمی کا شکار ہیں بھی، تب بھی ہمیں یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ ان کی غلط فہمی کس نوعیت کی ہے۔

**آیت 32:** جن کا نام بتانے کے لیے فرشتوں سے کہا گیا تھا جب وہ وہ نام بتانے میں ناکام ہو گئے تو انہوں نے اپنی کوتاہ علمی کا اعتراف کر لیا۔ اس مقام پر یہ سمجھنا ہمارے لیے ضروری ہے کہ وہ اصحاب الاسماء، مثلا آدم، نوع انسانی کے ارکان ہیں اور وہ تمام آدم ہی کی طرح خلیفہ ہیں۔ یہ فرض کرنا غلط نہیں ہوگا کہ فرشتوں کا سوال خلیفہ کی ذاتی حیثیت کے حوالے سے نہیں بلکہ چند مخصوص اختیارات رکھنے والے فرد کے حوالے سے تھا۔ بالفاظ دیگر، زیر بحث عبارت میں لفظ 'خلیفہ' ایک نوعی/نسلی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

**آیت 33:** ''کہا اے آدم! ان کو بتا ان لوگوں کے نام'' یعنی جن افراد کے بارے میں سوال کیا گیا ہے ان کے نام فرشتوں کو بتاؤ۔ اسی طرح ''تو جب اس نے بتائے ان کو ان لوگوں کے نام'' کا مطلب ہے کہ جب آدم نے ان افراد کے نام فرشتوں کو بتا دیے۔

علم اسماء کے حوالے سے فرشتوں کی جانب سے ان کی کوتاہ علمی کا اعتراف کرنے پر اللہ تعالی آدم سے کہتا ہے کہ وہ فرشتوں کو وہ نام بتائیں۔ جب آدم نام بتا چکے تو اللہ تعالی فرشتوں سے کہتا ہے ”میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ آسمانوں اور زمین کے بھید میں ہی جانتا ہوں“، یہ اسی بات کی تکرار ہے جو اللہ تعالی نے آیت 30 کے اخیر میں کہی تھی کہ ”میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔“ لیکن اس مقام پر اللہ تعالی نے یہ اضافہ کیا کہ ”اور میں جانتا ہوں اس چیز کو جس کو تم ظاہر کرتے ہو اور جس کو تم چھپاتے ہو۔“ یہ الفاظ اشارہ کرتے ہیں کہ فرشتوں نے جب اللہ تعالی سے سوال کیا، تو اپنے خیالات کا مکمل اظہار کرنے سے انہوں نے دانستہ گریز کیا۔ ایک خلافتی تقرر کے منفی نتائج سے متنبہ ہو کر انہوں نے محض اپنے اندیشوں کا اظہار کیا۔ بہر حال ان کے سوال کی اصل منشاء اس قسم کے تقرر کی معقولیت سے واقف ہونا تھی، اور یہی وہ منشاء تھی جس کے اظہار سے انہوں نے دانستہ گریز کیا۔

فرشتوں کو اپنے سوال کا جو جواب ملا، بظاہر وہ اس پر مطمئن معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اس جواب میں اصل نکتہ کیا ہے؟ ڈرامائی اسلوب میں دیا گیا جواب ان کے سوال کو کیسے خطاب کرتا ہے؟ جواب کا کلیدی لفظ ”الاسماء“ ہے جو آیت 31 میں ”اسمَاءَ کُلَّهَا“ کے الفاظ میں وارد ہوا ہے۔

اپنے سوال میں فرشتوں نے، ان کی رائے کے مطابق، انسانوں کے انہیں عطا کردہ اختیارات کے غلط استعمال کی وجہ سے پیدا ہونے والے منفی امکانات کی موجودگی پر زور دیا، تاہم یہ حقیقت ان پر منکشف نہ ہو سکی کہ ان اختیارات کو نیک اور صالح مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے بھی اتنے ہی مضبوط امکانات موجود ہیں۔ چوں کہ فرشتوں کی نظر تصویر کے محض ایک رخ پر تھی، اس لیے انہیں خلیفہ کی تقرری کے مثبت رخ سے واقف کرانا ضروری تھا۔ اس مقصد کے پیش نظر، اللہ تعالی نے ایک خالص نظری سوال کا نظری جواب دینے کے بجائے، فرشتوں کے سامنے ان تمام افراد کو پیش کیا جو مستقبل میں پیدا ہونے والے تھے۔ اس عمل کے ذریعے اللہ تعالی نے فرشتوں پر یہ واضح کر دیا کہ نوع انسانی محض ان افراد پر مشتمل نہیں ہوگی جو برے اعمال کریں گے، بلکہ اس میں وہ افراد بھی ہوں گے جو نیکی اور صالحیت کے لیے سرگرم عمل ہوں گے۔ بلکہ آیت میں یہ اشارہ بھی موجود ہے کہ انسانوں کے برے اعمال پر اچھے اعمال کا پلڑا بھاری رہے گا۔ اس مقام پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ آیت 31 کے الفاظ ”اسمَاءَ کُلَّهَا“ اگرچہ آنے والے تمام انسانوں پر مشتمل ہیں، لیکن اسی آیت میں اسم اشارہ ”هٰؤُلَاءِ“ بتاتا ہے کہ اسمَاءَ کُلَّهَا سے خاص طور پر نیک اور صالح انسان مراد ہیں۔ یہ اس لیے بھی ممکن ہے کہ جب خاص طور پر نیک و صالح افراد کا تذکرہ ہوگا تبھی فرشتوں کے خوف و اندیشہ سے بھرپور سوال کا ٹھیک ٹھیک جواب ادا ہو سکے گا۔ اتفاق سے اس بات کی تصدیق کہ اللہ تعالی نے فرشتوں کے سامنے جن کے نام پیش کیے تھے، ان کا تعلق نسل انسانی سے تھا، سورہ اعراف کی آیت نمبر 172 سے بھی ہوتی ہے۔ سورہ اعراف کی اس آیت کے مطابق اللہ تعالی نے قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کو، جنہیں اس نے صلب آدم سے پیدا کیا تھا، عالم ازل میں یکجا کیا اور ان سے اپنی ربوبیت کا اقرار کروایا۔

آیات کے اگلے مجموعے (34 تا 39) میں جس منظر کی تصویر کشی کی گئی ہے، وہ انہی واقعات کا تسلسل ہے جن کا تذکرہ پہلے مجموعہ میں کیا گیا ہے۔

**آیت 34:** اللہ تعالی فرشتوں کو آدم کے آگے سجدہ ریز ہونے کا حکم دیتا ہے۔ تمام فرشتے حکم کی تعمیل کرتے ہیں سوائے ابلیس یا شیطان کے، جو تکبر کی بنا پر سجدہ کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ آدم کو سجدہ کرنا اس بات کی علامت ہے کہ آدم کو، اور آدم کے ذریعے پوری نوع انساں کو فرشتوں پر، بلکہ تمام دیگر مخلوقات پر ایک گونہ تفوق حاصل ہے، کیوں کہ فرشتے تخلیق آدم سے پہلے تمام مخلوقات سے برتر مخلوق کی نمائندگی کرتے تھے۔

آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ ابلیس فرشتوں میں سے ایک تھا۔ حالانکہ اسلام میں ایسے کسی فرشتے کا تصور نہیں ہے جو رسوا اور ذلیل ہو۔ سورہ تحریم کی آیت نمبر 06 کے مطابق، فرشتے کسی امر الہی کی نافرمانی نہیں کر سکتے۔ سورہ کہف کی آیت نمبر 50 بصراحت بیان کرتی ہے کہ ابلیس اس مخلوق میں سے تھا جس کا نام ’جن‘ ہے، جن کی تخلیق آگ سے ہوئی ہے۔ (جب کہ ایک حدیث کی بنیاد پر یہ مانا جاتا ہے کہ فرشتوں کی تخلیق نور سے ہوئی ہے) اور انسانوں کی طرح انہیں بھی یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ خدا کی فرماں برداری کریں یا نافرمانی۔ چوں کہ تخلیق آدم سے قبل، فرشتوں کا تمام مخلوقات کے اعلی ترین طبقہ سے تعلق تھا، تو جب اللہ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں تو اس میں بدیہی طور پر تمام نچلے درجہ کی مخلوقات، بشمول جن، کے لیے بھی یہ حکم مضمر تھا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں۔ چنانچہ فرشتوں نے حکم الہی کی تعمیل کی لیکن ابلیس نامی جن نے تعمیل حکم سے ابا کیا۔

”وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ“ (ترجمہ: اور کافروں میں سے بن گیا) اس کے تین میں سے ایک معنی ہو سکتے ہیں: اول، ابلیس کافر بن گیا۔ قطع نظر اس سے کہ آیا اس وقت کوئی اور بھی کافر موجود تھا یا نہیں۔ دوم، ابلیس پہلے سے موجود باغی جنوں کے گروہ میں شامل ہو گیا۔ سوم، ابلیس حکم الہی کی خلاف ورزی کرنے والے کئی فرشتوں میں سے ایک تھا۔ اور ان کے ذریعے کافروں کا ایک گروہ وجود میں آ گیا۔

**آیت 35:** اللہ تعالی آدم و حوا کو جنت کے باغ میں رہنے کا حکم دیتا ہے۔ وہ انہیں اجازت دیتا ہے کہ جنت کی جس نعمت سے چاہیں لطف اندوز ہوں۔ اسی کے ساتھ وہ انہیں ایک مخصوص درخت کے پھل کھانے سے منع

بھی کرتا ہے۔اس آیت میں منع کرنے کے لیے لفظ ''پھٹکنا'' (''وَلَا تَقْرَبَا'') کا استعمال بتاتا ہے کہ آدم وحوا کو اس درخت سے دور دور رہنے کی تاکید خوب اچھی طرح کر دی گئی تھی۔کیوں کہ اس درخت کے قریب جانے سے اس کے پھل کا مزہ چکھنے کا اشتیاق ہوسکتا تھا۔قرآن اس کی تعیین نہیں کرتا کہ وہ کون سا درخت تھا جس کے پھل نہ کھانے کی آدم وحوا کو تاکید کی گئی تھی۔معلوم ہوتا ہے کہ جس مقصد کے پیش نظر قصہ آدم بیان کیا گیا ہے اس میں اس درخت کا نام بتانا کسی اہمیت کا حامل نہیں تھا۔

**آیت 36:** جب آدم وحوا شیطان کے بہکاوے میں آ گئے تو وہ جنت کے اس عیش عشرت سے محروم ہوگئے جس میں وہ اب تک تھے۔''فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ'' کا مطلب ہے کہ شیطان انہیں پھسلانے میں کامیاب رہا۔یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ پھسلانے کے عمل کو شیطان سے منسوب اس لیے کیا گیا ہے کہ اس سلسلہ حوادث کے پس پردہ دراصل شیطان ہی کارفرما تھا جو بالآخر آدم وحوا کے عیش وعشرت سے محروم ہوجانے پر منتج ہوا۔

اللہ تعالی کا حکم کہ ''اِهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ'' (ترجمہ: اترو، تم ایک دوسرے کے دشمن ہوگے) کا خطاب دو فریق سے ہے جو ایک دوسرے کے ازلی دشمن ہیں۔فریق اول آدم وحوا اور ان کی آئندہ نسل پر مشتمل ہے اور فریق ثانی، شیطان اور اس کی نسل پر۔دونوں ہی کو حکم دیا جارہا ہے کہ زمین پر اتر جائیں۔موجودہ سیاق میں یہ فقرہ جس میں کہا گیا ہے کہ ''وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ'' (ترجمہ: تمہارے لیے ایک وقت خاص تک زمین میں رہنا بسنا اور کھانا پینا ہے) بنیادی طور پر نسل انسانی سے خطاب کرتا ہے، اگرچہ کہ اصولی طور پر اس کا خطاب جنوں کی نسل (جس سے ابلیس یا شیطان کا تعلق ہے) سے بھی ہے۔کیوں کہ قرآن کے مطابق جن بھی انسانوں ہی کی مانند ہیں، وہ بھی اخلاقی وجود رکھتے ہیں، ان میں بھی بعض نیک اور بعض بدطینت ہوتے ہیں (ملاحظہ ہو سورہ جن)۔خود ابلیس کا تعلق بھی جنوں کے اسی بدطینت گروہ سے ہے۔

شیطان کا آدم وحوا کے ''پھسلائے جانے'' کا ''ذریعہ'' بننا، اس امر پر دلالت نہیں کرتا کہ آدم وحوا بے اختیار اور شیطان کے ہاتھوں کا لاچار کھلونا تھے۔قرآن آدم وحوا کو بھی شجر ممنوعہ کا پھل کھا لینے کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔''پھسلائے جانے'' کی تعبیر واضح طور پر بتاتی ہے کہ آدم وحوا درحقیقت امر الٰہی سے باغی نہیں تھے بلکہ وہ شیطان کی ترغیب اور اس کے بہکاوے کا شکار ہوگئے تھے۔ان الفاظ کے ذریعے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ درخت کا پھل نہ کھانے کے حکم الٰہی پر آدم وحوا کی نافرمانی اس قدر سنگین نہ تھی جتنی کہ آدم کو سجدہ کرنے کے حکم پر خود شیطان کی نافرمانی۔

**آیت 37:** آدم کا اپنے رب کی جانب سے ''چند کلمات'' کے ''پا لینے'' کا مطلب یہ ہے کہ آدم نے کلمات توبہ خود اللہ تعالی سے سیکھے۔سورہ اعراف کی آیت 23 کے مطابق توبہ کے یہ الفاظ آدم وحوا دونوں نے ادا کیے تھے۔''قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ'' (ترجمہ: وہ بولے اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہماری مغفرت نہ فرمائے گا اور ہم پر رحم نہ فرمائے گا تو ہم نامرادوں میں سے ہوجائیں گے) ان کلمات کی ادائیگی پر اللہ تعالی نے آدم وحوا کی توبہ قبول کر لی۔آدم کے اپنے رب کی جانب سے توبہ کے کلمات پا لینے کے لیے عربی لفظ ''تَلَقّٰى'' استعمال ہوا ہے، فعل کی یہ شکل مشقت کا پتہ دیتی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شجر ممنوعہ کا پھل کھا لینے کے بعد آدم احساس ندامت سے دوچار ہوئے تھے، اور وہ اپنی توبہ میں مخلص تھے۔سورہ اعراف کی آیت 23 سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم کے احساس ندامت میں حوا بھی شریک تھیں اور توبہ میں بھی وہ شامل تھیں۔

یہ آیت اس تصور کی نفی کرتی ہے کہ ہر انسان پیدائشی گنہ گار ہے: ممنوعہ درخت کا پھل کھا کر آدم وحوا ایک غلطی کے مرتکب ہوئے تھے، لیکن انہوں نے اللہ سے توبہ چاہی، اور رب کریم نے انہیں معاف کر دیا۔توبہ کا تصور مستقبل میں کسی نجات دہندہ کے ظہور کی حاجت کو رفع کر دیتا ہے۔

**آیت 38،39:** آیت 36 کی طرح ان آیات میں بھی ''اِهْبِطُوا'' (ترجمہ: اترو/عربی میں یہ جمع کا صیغہ ہے) کے حکم سے شروع ہونے والا حکم ایک جانب آدم وحوا اور ان دونوں کے ذریعے پوری نوع انساں سے خطاب کرتا ہے، اور دوسری جانب یہ ابلیس اور اس کے ذریعے جنوں کی نسل سے خطاب کرتا ہے۔اس مقام پر بھی بنیادی طور پر انسان ہی مخاطب ہیں جنہیں کہا گیا ہے کہ ان کی حتمی قسمت کا انحصار اس بات پر ہوگا کہ وہ الٰہی ہدایت کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ہدایت کی پیروی انہیں جنت میں داخل کرے گی، جسے قرآن میں تمثیلی انداز میں ایک ایسی جگہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے جس کے مکینوں کو نہ مستقبل کے حوالے سے کسی قسم کا خوف وخطر لاحق ہوگا اور نہ ماضی میں کسی غلطی پر ندامت وافسوس ہی کی ضرورت ہوگی۔جب کہ ہدایت سے روگردانی مخاطبین کو نار جہنم میں جھونک دے گی۔

آیت 38 میں دیا گیا حکم کہ ''اتر جاؤ یہاں سے'' اس امر پر دلالت نہیں کرتا کہ اس کا تعلق آدم کی سزا سے ہے۔کیوں کہ آیت 37 کی روشنی میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ ''اتر جانے'' کا حکم آدم وحوا کی توبہ، اللہ تعالی کی جانب سے قبول کر لیے جانے کے بعد صادر ہوا ہے۔

آیت 38 میں "فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُم مِّنِّی هُدًی" (ترجمہ: تو اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت) کے الفاظ بتاتے ہیں، چوں کہ یَاْتِیَنَّکُم کی شکل میں عربی میں فعل تاکید استعمال ہوا ہے، کہ انسانوں کو ہدایت الٰہی سے لازماً سرفراز کیا جائے گا۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک وعدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں اور آسمانی کتابوں کے ذریعے انسانوں کی ہدایت کا سامان کرتا رہے گا۔ تاہم واضح رہے کہ یہ آیت اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اگر کسی انسان تک ہدایت الٰہی نہ پہنچ سکے تو اسے آزادانہ زندگی گزارنے کا جواز حاصل ہو جائے گا۔ اسلام میں، انسانوں کو دیا گیا الٰہی عطیہ 'عقل'، انسانوں کو بنیادی جوابدہی کا سزاوار بناتی ہے۔ اسلام کی نظر میں اس کائنات کی بنیادی سچائی 'توحید' ہے اور انسان کسی الٰہی ہدایت کی مدد کے بغیر محض اپنی عقلی صلاحیت کو بروئے کار لا کر اس سچائی کا عرفان حاصل کر سکتا ہے۔ اس میں یہ بات مضمر ہے کہ قطع نظر اس سے کہ خدا کی جانب سے کسی ہدایت کا انتظام کیا جاتا ہے یا نہیں، ہر انسان سے یہ توقع ہے کہ کم از کم عقیدہ توحید کے حوالے سے وہ کسی کج فکری کا شکار نہ ہو۔

## مسائل

**1۔ انسان بحیثیت خلیفہ:** زیر مطالعہ قرآنی عبارت انسانوں کو زمین پر اللہ کا خلیفہ قرار دیتی ہے۔ خلیفہ اسے کہتے ہیں جسے چند اختیارات عطا کیے گئے ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو بحیثیت خَلِیفَۃُ اللّٰہِ اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر دنیا کے وسائل کو مسخر کر کے اور انہیں زیر استعمال لا کر، اس زمین پر حکومت کرنی ہے۔ تاہم اسے یہ کام اللہ تعالیٰ، جس نے انسان کو یہ اختیارات سونپے ہیں، کی ہدایات کے مطابق انجام دینا ہے۔

خلیفہ کے تقرر پر فرشتوں کا اظہار تعجب یہ بتاتا ہے کہ تخلیق آدم سے پہلے خلافت کا کوئی منصب موجود نہیں تھا۔ فرشتوں کی حیرت سے اس منصب کی مہلک فطرت و مزاج کا پتہ بھی چلتا ہے: خلیفہ کو برے کام انجام دینے کا اختیار بھی حاصل ہوگا جیسا کہ فرشتوں کا گمان ہے۔ البتہ فرشتوں کے سوال کا ڈرامائی اسلوب میں جواب دینا یہ بتاتا ہے کہ انسان کو نیک اعمال کرنے کا اختیار بھی حاصل ہوگا۔ درحقیقت فرشتوں کے سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ کا مفصل استدلال، اللہ تعالیٰ، جو یہ جاننے کے باوجود کہ انسان خلافت سے متعلق اپنے اختیارات کا غلط استعمال بھی کر سکتا ہے، انسان ہی کو اپنا خلیفہ منتخب کرتا ہے، کی جانب سے ایک یقینی خوش امیدی کو ظاہر کرتا ہے۔ انسانی خلافت کا مزاج اپنی اصل کے اعتبار سے اخلاقی ہے۔ فرشتوں کا سوال بتاتا ہے کہ محض اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کے قابل ہونا، کسی مخلوق کو بار خلافت اٹھانے کا اہل نہیں بناتا، فرشتوں نے اسی بنا پر یہ سمجھ لیا تھا کہ خلیفہ کا تقرر ان میں سے نہیں ہوگا۔ جیسا کہ اس عبارت کا اختتامی حصہ اشارہ کرتا ہے، انسانوں کے بطور خلیفہ تقرر کا اصل مقصد انسانوں کو آزمائش میں ڈالنا ہے۔ وہ انسان جو ہدایت الٰہی کی پیروی کریں گے، خوش انجام ہوں گے۔ جب کہ وہ لوگ جو ہدایت الٰہی سے منہ موڑیں گے شومی انجام سے دوچار ہوں گے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ انسان محدود اور عارضی طور پر اللہ کا خلیفہ ہے، مطلق اور دائمی طور پر نہیں۔ اس منصب سے وابستہ ذمہ داریوں کی ٹھیک ٹھیک ادائیگی، انسان کی خلافت کو برقرار رکھے گی۔ جب کہ ان ذمہ داریوں سے پہلوتہی اور ان کی ادائیگی میں ناکامی، اس منصب سے انسان کی معزولی کی موجب ہوگی۔

**2۔ فطرت انسانی:** یہ عبارت انسانی فطرت کے حوالے سے بھی ایک تبصرہ کرتی ہے۔ انسان منع کردہ اشیاء کی طرف راغب ہونے کا داعیہ رکھتا ہے۔ شیطان نے اسی انسانی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر آدم و حوا کو پھسلایا تھا۔ آدم و حوا کو جنت میں عیش و عشرت کا بے پناہ سامان بہم پہنچایا گیا تھا اور انہیں صرف ایک مخصوص درخت کے پاس جانے سے منع کیا گیا تھا، اس میں یہ حقیقت پنہاں ہے کہ انسان بے شمار نعمتیں اور اسباب عیش و عشرت میسر ہونے کے بعد بھی، منع کردہ اشیاء کی طرف راغب ہونے کا میلان رکھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کی خوش حالی کا انحصار اس ایک شئے کو بھی حاصل کر لینے پر ہے جو اسے میسر نہیں کی گئی ہے۔

**3۔ شیطان بہ حیثیت دشمن انسان:** آیت نمبر 34 بتاتی ہے کہ یہ شیطان کا غرور تھا جس نے اسے آدم کو سجدہ کرنے کے حکم الٰہی کی نافرمانی پر مجبور کیا۔ آیت نمبر 36 میں، جس میں ایک خاص درخت کا پھل نہ کھانے کے حکم الٰہی کے حوالے سے شیطان کے ذریعے آدم و حوا کو پھسلائے جانے کا تذکرہ ہے، صراحت کے ساتھ بتاتی ہے کہ یہ شیطان کا شکستہ احساس غرور تھا جس نے اسے اس عمل پر اکسایا تھا۔ آیت یہ بھی بتاتی ہے کہ آدم و حوا کو پھسلا کر وہ انہیں اللہ تعالیٰ کے غضب کا شکار بنانا چاہتا تھا، ایسا وہ اس لیے کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ ان سے انتقام لے سکے۔ وہی آیت جس میں بتایا گیا ہے کہ شیطان انسان کا دشمن ہے، انسانوں کو مستقبل میں شیطان کی ممکنہ فتنہ پردازی، سازش اور عیاری سے پیشگی متنبہ کرتی ہے۔

## لسانی و ادبی نوٹس

**1۔** دونوں ہی مجموعہ آیات 30 تا 33 اور 34 تا 39 جن پر عبارت مشتمل ہے، اگرچہ کہ مختصر، لیکن اپنے آپ میں ایک مکمل قصہ بیان کرتے ہیں۔ دونوں قصوں میں ایک مناسب ابتدائیہ، نقطہ عروج اور ایک کلائمکس (اختتامیہ) موجود ہے۔ پہلے مجموعہ میں فرشتوں کی جانب سے اٹھایا

گیا سوال، قصے کو ایک دلچسپ رخ عطا کرتا ہے، ٹھیک اسی طرح دوسرے مجموعہ میں آدم و حوا کا شیطان کی اشتعال انگیزی کا شکار ہو جانا، قصے میں (قاری کے لیے) ایک دلچسپی کا سامان پیدا کر دیتا ہے۔ دونوں قصوں میں پیدا شدہ مشکل کا حل پایا جاتا ہے۔ پہلے میں ایک ڈرامائی اسلوبِ جواب کے ذریعے، اور دوسرے میں آدم کے اظہار ندامت کے ذریعے۔ عبارت میں پیش کردہ دونوں قصوں کے ڈرامائی اسلوب کو قرآن کے ذریعے مکالمہ (Dialogue) کو محض بیان (Description) پر ترجیح دیے جانیکے عمل سے، مزید تقویت ملتی ہے۔

2۔ پہلے قصے کے کلیدی کردار اللہ تعالی، فرشتے اور آدم ہیں۔ جب کہ دوسرے قصے میں کلیدی کردار اللہ تعالی، ابلیس اور آدم و حوا ہیں پہلے قصے کے بعض کرداروں کا رول دوسرے قصے میں بدل جاتا ہے۔ بطور خاص آدم کا رول۔ پہلے قصے میں آدم کو اللہ تعالی نے حکم دیا کہ وہ فرشتوں کو تمام ناموں سے آگاہ کریں۔ یہاں آدم حکم الٰہی کی تعمیل کے پابند ہیں۔ جب کہ دوسرے قصے میں ان کا کردار ایک آزاد اور با اختیار شخص کا ہے جس نے اپنی مرضی سے ایک ایسا قدم اٹھایا جس کا خمیازہ اسے بھگتنا پڑا۔

3۔ اس عبارت میں قرآن کا 'حوالہ جاتی' اسلوب بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ مثال کے طور پر آیت 31 کا آغاز اس فقرے سے ہوتا ہے کہ ''اور اس نے سکھا دیے آدم کو سارے نام۔'' یہاں ''ناموں'' کا حوالہ بظاہر غیر متوقع محسوس ہوتا ہے۔ کیوں کہ قرآن کے اس مقام تک ہمیں ''سارے نام'' کے بارے میں تو کجا، کسی 'نام' کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا ہے۔ عبارت کا گہرا تجزیہ کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ چوں کہ فرشتوں کا سوال ایک ایسی مخلوق کے بارے میں تھا جو، ان کے خیال میں، زمین پر فساد مچا سکتی تھی، اس لیے ان کے سوال کا شافی جواب دینے کے لیے ناگزیر تھا کہ جواب میں اس مخلوق کا حوالہ بھی موجود ہو۔ خدا سے جب فرشتوں نے یہ سوال کیا کہ مبادہ وہ ایک ایسی مخلوق کو خلیفہ مقرر کرنے جا رہا ہے جو فساد مچائے گی، ان کے ذہن میں نوع انسانی کے محض چند افراد ہی کا نام تھا۔ ضرورت تھی کہ انہیں بتایا جائے کہ نوع انساں صرف ان انسانوں پر مشتمل نہیں ہوگی جن کے حوالے سے اندیشہ ہے کہ وہ زمین پر برا کام کر سکتے ہیں بلکہ اس میں وہ افراد بھی شامل ہوں گے جو نیک اور صالح اعمال انجام دیں گے۔ اسی سے قرآن کی مختصر سی تعبیر ''كُلَّهَا'' (سارے نام) کی اہمیت کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ ابھی ابھی جس مثال کا تجزیہ کیا گیا ہے، وہ اس حقیقت کو بھی نمایاں کرتی ہے کہ قرآن کے مختلف مقامات پر مختصر مختصر قرآنی تعبیریں اپنے اندر معنی کی ایک وسیع دنیا سمیٹے رکھتی ہیں۔ معنی کی وہ دنیا جسے سنجیدہ اور گہرے مطالعہ کے ذریعے ہی آشکار کیا جا سکتا ہے۔

4۔ عبارت میں دو قسم کی تبدیلیاں بھی نوٹ کیے جانے کے قابل ہیں۔ ایک ضمائر کی، دوسری مخاطبین کی۔ پہلی تبدیلی ضمائر کی ہے جس میں ضمیر مفرد متکلم اور ضمیر جمع متکلم شامل ہیں، اور دونوں میں ضمیر کا مرجع اللہ تعالی ہے۔ ضمیر مفرد آیات 30 اور 31 میں استعمال ہوئی ہے، اور ضمیر جمع آیت 34 تا 36 میں۔ لیکن آیت 38 میں شروع میں ضمیر جمع کے استعمال کے بعد دو مرتبہ ضمیر مفرد بھی استعمال ہوئی ہے، اس کے بعد آیت 39 میں پھر ضمیر جمع ہی استعمال ہوئی ہے۔ (لسانی) قاعدے کی رو سے معلوم ہوتا ہے کہ ضمیر جمع الٰہی جاہ و جلال یا حاکمیت (برتری و بالاتری کے مضمر اشارے کے ساتھ) کو ظاہر کرتی ہے۔ جب کہ ضمیر مفرد الفت الٰہی یا نسبت الٰہی (کلی نفوذ کے مضمر اشارے کے ساتھ) کو ظاہر کرتی ہے۔ شاید اسی فرق کی وجہ سے مکالماتی موقع و محل کے سیاق میں ضمیر مفرد، اور خود کلامی موقع و محل کے سیاق میں، یا ایک ایسے سیاق میں جہاں اپنی بالادستی کا اصرار مقصود ہو، ضمیر جمع موزوں تر معلوم ہوئی۔ اس طرح آیات 30 تا 33، جن میں ضمیر مفرد استعمال ہوئی ہے، خدا اور فرشتوں کے مابین ایک مکالمے کو بیان کرتی ہیں۔ جس میں دو فریق ایک دوسرے کے ساتھ محو گفتگو ہیں۔ ان کے مکالمے ہیں: ''میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں'' (آیت 30)، ''اگر تم سچے ہو تو مجھے ان لوگوں کے ناموں سے آگاہ کرو'' (آیت 31)، ''کیا میں نے تم سے نہیں کہا کہ آسمانوں اور زمین کے بھید کو میں ہی جانتا ہوں'' (آیت 33)۔ جب کہ دوسری طرف آیات 34 تا 36 کے یک طرفہ مکالمے اور آیت 38 کے ابتدائی نصف حصے میں، اللہ تعالی تحکمانہ لہجے میں اپنی بالادستی کا دعوی کرتا ہے۔ مثلاً: ''اور یاد کرو جب کہ ہم نے کہا فرشتوں سے کہ آدم کو سجدہ کرو'' (آیت 34)، ''اور ہم نے کہا اے آدم تم اور تمہاری بیوی دونوں رہو جنت میں'' (آیت 35)، ''ہم نے کہا کہ اترو، تم ایک دوسرے کے دشمن ہوگے'' (آیت 36)۔ آیت 38 کے دوسرے نصف حصے میں ضمیر مفرد کا استعمال (''تو اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت، تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے۔۔۔'') ہدایت بھیجنے والی الٰہی ہستی اور اس ہدایت کو حاصل اور اس سے استفادہ کرنے والے انسانوں کے قریبی رشتہ و تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔ ضمیر مفرد کا استعمال اس خیال کو بھی تقویت عطا کرتا ہے کہ خدا ہی تنہا سرچشمہ رشد و ہدایت ہے۔ ہدایت الٰہی کی پیروی سے انکار منکرین پر عذاب الیم کو دعوت دیتا ہے۔ اسی وجہ سے آیت 39 میں ضمیر جمع ''ہماری آیات'' استعمال ہوئی ہے۔

عبارت میں مخاطبین کی تبدیلی دو قسم کی ہے۔ مخاطب غائب (Third Person)، متکلم (First Person) میں تبدیل ہو جاتا ہے، اور متکلم، مخاطب غائب میں۔ آیات 30 تا 33 میں اللہ تعالی کی نسبت مخاطب غائب کے حوالے سے ہے۔ جیسا کہ ان آیات میں ہے: ''اور یاد کرو جب

کہ تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا'' (آیت 30)، ''اور اس نے سکھا دیے آدم کو سارے نام'' (آیت 31)۔ جب کہ آیت 34 کے آغاز سے زیادہ تر مقامات پر ضمیر متکلم استعمال ہوئی ہے۔ مثلا: ''اور یاد کرو جب کہ ہم نے کہا فرشتوں سے'' (آیت 34)، ''اور ہم نے کہا'' (آیت 35)، ''ہم نے کہا'' (آیت 36 اور 38)۔ یہاں یہ قاعدہ معلوم ہوتا ہے کہ ضمیر غائب عام بیان کے لیے زیر استعمال آئی ہے، جب کہ ضمیر متکلم کا استعمال فرد زیر بحث سے براہ راست تعلق پر دلالت کرتی ہے۔

## بائبل سے تقابل و موازنہ

قرآن قصہ آدم کا تذکرہ متعدد مقامات پر کرتا ہے۔ مختلف مقامات پر اس کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرتا ہے۔ درج ذیل پیراگراف میں قصہ آدم کا بائبل سے جو تقابل و موازنہ کیا گیا ہے اس کا تعلق اس قصے سے ہے جو قرآن میں سورہ بقرہ کی آیات 30 تا 39 میں بیان ہوا ہے۔

آدم کے حوالے سے قرآن اور بائبل کے قصوں میں بعض بالکل نمایاں مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دونوں آسمانی کتابوں میں انسان کو خصوصی حیثیت عطا کی گئی ہے، (قرآن 2:30، عہد نامہ عتیق 1:26-27)۔ آدم وحوا کو جنت میں داخل کرنا، (قرآن 2:35، عہد نامہ عتیق 2:18, 15)۔ آدم وحوا کو ایک مخصوص درخت سے دور رہنے کا حکم، (قرآن 2:35، عہد نامہ عتیق 2:16-17)۔ شیطان کا آدم وحوا کو ممنوعہ درخت کا پھل کھانے پر اکسانا، (قرآن 2:36، عہد نامہ عتیق 3:6)۔

اس کے علاوہ بعض بالکل نمایاں اختلافات بھی پائے جاتے ہیں۔ قرآن میں فرشتوں کے ایک سوال کا جواب دینے کے لیے آدم فرشتوں کو نسل انسانی میں سے چند نام بتاتے ہیں، جو انھوں نے خود اللہ سے سیکھے ہیں، جب کہ بائبل میں آدم کو خود ہی مخلوقات کا نام بتانے کا اختیار ہے: ''کسی جاندار مخلوق کو انسان نے جس نام سے بھی پکارا، وہی اس کا نام تھا۔'' (عہد نامہ عتیق 2:19-20)۔ قرآن اس کی وضاحت نہیں کرتا کہ وہ کون سا درخت تھا جس سے دور رہنے کا حکم آدم وحوا کو دیا گیا تھا، جب کہ بائبل کے مطابق یہ 'علم خیر وشر' کا درخت تھا (2:9,17) قرآن کے مطابق آدم وحوا کو شیطان نے ورغلایا (2:36) جب کے بائبل کے مطابق یہ ایک اژدہا تھا (عہد نامہ عتیق 3:1-5)۔ غالباً دونوں کے بیان کردہ قصوں میں اصل فرق 'غالب نقطہ نظر' کا ہے۔ چوں کہ بائبل میں قصہ کے حوالے سے نقطہ نظر تاریخی ہے، اس لیے اس کا بیان زمان ومکان کے فریم ورک میں ہوا ہے۔ جب کہ اس قصہ کے حوالے سے قرآن کا نقطہ نظر دینی ہے، کیوں کہ قصے میں زیادہ توجہ آدم کے بحیثیت خَلِیفَۃُ اللّٰہ اخلاقی کردار پر مرکوز ہے، اس لیے اس کا بیان زمان ومکان کی قیود سے ماوراء ہے۔ نیز، بائبل کا بیان خاص طور پر زیادہ تفصیلی ہے۔

ایک اور نکتہ بھی قابل توجہ ہے۔ عبارت زیر مطالعہ کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالی کا انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ مقرر کرنے کا فیصلہ کافی پہلے ہو چکا تھا، حتی کہ اس سے بھی پہلے کہ شیطان انسان کو بہکائے۔ قرآن بصد صراحت کہتا ہے شیطان کا ورغلانا بالکل ثانوی اہمیت رکھتا ہے اور یہ واقعہ واقع ہوتا یا نہ ہوتا، اس سے اس خدائی فیصلے پر کچھ اثر نہ پڑتا جس کے تحت وہ انسان کو زمین پر بھیجنے والا تھا۔ قرآن کے مطابق انسان کو اس کی غلطی معاف کر دی جانے کے باوجود زمین پر بھیجا گیا۔ ایسا اس وجہ سے نہیں ہوا کہ انسان کو سزا دینا مقصود تھا، بلکہ یہ ایک پہلے سے طے شدہ خدائی اسکیم کا حصہ تھا۔ دوسری جانب بائبل کے مطابق انسان کو اس کی غلطی کی پاداش میں جنت سے نکال کر دنیا میں بھیج دیا گیا تھا۔ یہی وہ روایت ہے جس نے عیسائیت کی اکثریت میں انسان کے پیدائشی گنہ گار ہونے کے تصور کو فروغ دیا۔ اسلام میں اس قسم کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔ اسلامی تعلیمات کی رو سے اللہ تعالی نے آدم وحوا کو معاف کر کے ان کا نامہ اعمال بالکل صاف کر دیا تھا، تا کہ وہ زمین پر ایک نئی زندگی کا آغاز کر سکیں۔ اس کے باوجود قرآن میں آدم وحوا کو جنت میں شیطان کے ذریعے ورغلائے جانے کا جو قصہ بیان ہوا ہے، وہ ایک مقصد کی تکمیل کرتا ہے۔ یہ آدم وحوا کو اپنی قوتوں اور کمزوریوں سے واقف ہونے کا ایک موقع فراہم کرتا ہے۔ کمزوری کی حالت میں انسان خدا کی نافرمانی کر سکتے ہیں اور اس بنا پر خدا سے دور ہو سکتے ہیں، تاہم ان کے پاس یہ موقع اور صلاحیت موجود ہے کہ وہ توبہ کر کے اللہ کی جانب رجوع کر سکیں۔ آدم وحوا کے لیے، جنت میں شیطان سے مڈبھیڑ کی حیثیت، دنیا میں ان کی آئندہ زندگی کی ایک مشق کی ہے۔ اگر جدید زمانے کی مناسبت سے مثال دی جائے تو یہ ویسے ہی ہے جیسے خلا میں جانے والے خلانوردوں کو پہلے ایک جعلی خلائی کمرے میں رکھا جاتا ہے، تا کہ وہ اس زندگی کا مزہ چکھ لیں جس میں ایک مختصر عرصے کے بعد انہیں داخل ہونا ہے۔ آدم وحوا بھی جنت میں اسی زندگی کا مزہ چکھتے ہیں، جس میں انہیں ایک مختصر عرصے کے بعد داخل ہونا ہوگا۔

**PROF MUSTANSIR MIR**
1, University Plaza, Youngstown,
Ohio, 44555-USA

**SAUD FIROZ AHMED**
Editor, Rafeeq e Manzil Monthly
New Delhi
sfsaudfiroz@gmail.com

# وکاس اور وشواس کے بجائے مندی اور بیروزگاری کے 100 دن

ڈاکٹر سلیم خان

2014 میں انتخاب جیتنے کے بعد مودی سرکار نے ہاف سنچری یعنی 50 واں دن بھی منایا تھا لیکن اب کی بار وہ کب آیا اور کہاں گیا پتہ ہی نہیں چلا۔ اس مرتبہ سنچری مکمل کرنے پر جشن منانے کا فیصلہ کیا گیا، لیکن اسی کے ساتھ تنقید کا پٹارہ بھی کھل گیا۔ آگے بڑھنے سے قبل وزیراعظم کی کناڈا میں دی ہوئی ریاضی کی تمثیل قابل توجہ ہے۔ انہوں نے کہا تھا الف اور ب کو تنہا مربع کر کے جمع کیا جائے تو الف مربع جمع ب مربع ( $a^2 + b^2$ ) بنتا ہے لیکن اگر ترتیب الٹ کر پہلے مربع اور بعد میں جمع کرنے کے بجائے پہلے جمع اور پھر مربع کیا جائے تو اضافی 2 الف ب نکل آتا ہے یعنی $(a+b)^2$ کرنے سے ( $a^2 + b^2 + 2ab$ ) ہوجاتا ہے۔ سوشل میڈیا میں اس منطق کا خوب مذاق اڑایا گیا لیکن اس کو دوبارہ ایک نئے تناظر میں دیکھیں۔

2019 کے نتائج سے قبل مودی جی سرکار میں اور شاہ جی پارٹی میں تھے۔ دونوں کو مربع کیا جاتا تھا تو م مربع جمع ش مربع ( $m^2 + s^2$ ) بنتا تھا۔ اب کی بار شاہ جی سرکار کے اندر آگئے یعنی م جمع ش مربع $(m+s)^2$ ہوگئے۔ اس ساتھ کے نتیجے میں 2 م ش کا اضافہ یعنی وکاس اور وشواس نامی جڑواں بیٹے کے جنم لینے کی امید تھی۔ لیکن ہوا یہ کہ مندی اور بیروزگاری نامی دو اولادیں پیدا ہوگئیں۔ جواب 100 دن کی ہوگئی ہیں۔ وہ دودھ مانگتی ہیں تو سرکار ان کو کشمیر کی لوری سناتی ہے۔ وہ روتی بلکتی ہیں تو پاکستان کا شور مچایا جاتا ہے اور تھک کر سو جاتی ہیں تو انہیں خواب میں چندا ماما کی سیر پر روانہ کردیا جاتا ہے۔ 100 دن کے پورا ہونے پر وزیر دفاع راج ناتھ سنگھ نے کہا کہ اس دوران وہ ایک شب بھی چین سے نہیں سوئے۔ اس کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔ بعید نہیں کہ شاہ جی نے جن لوگوں کی نیند حرام کر رکھی ہے ان میں راجناتھ سنگھ کا نام بھی ہو۔ کوئی نہیں جانتا کہ کب کون سی فائل کھل جائے اور اپنے آپ کو ہریش چندر ثابت کرنے کے چکر میں مودی جی ان کی بلی چڑھا دیں۔

مودی سرکار کے دوبارہ بننے کے بعد پہلے 100 دنوں میں جیٹلی جی کے وکاس اور سشما جی کے وشواس کا بھی سورگ باس ہوگیا۔ اس دوران

قانونی، انتظامی اور معاشی سطح پر تین اہم اقدامات کیے گئے۔ سب سے پہلے جموں و کشمیر کے خصوصی درجے سے متعلق دفعہ 370 کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اس کے بعد سے وادی میں کرفیو نافذ ہے۔ 35 دنوں سے مواصلات کا نظام معطل ہے۔ ذرائع ابلاغ پر پابندی لگی ہوئی ہے۔ نہ عید منائی گئی اور نہ محرم کے جلوس نکلے۔ گویا جنت نظیر وادی کو ایک کھلی جیل میں تبدیل کر دیا گیا۔ یہ سب اس لیے کیا گیا تاکہ کشمیر کو ہندوستان کے دیگر صوبوں کے مساوی کر دیا جائے۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ ملک کی دیگر ریاستوں کو کشمیر کے برابر کر دیا جائے۔ یعنی آج جو کچھ کشمیر میں ہو رہا ہے کل پورے ملک میں کیا جائے۔ یہ سرکار اگر 100 سے 1000 دن مکمل کر لیتی ہے تو بعید نہیں کہ پورا ملک ایک بہت بڑی جیل میں بدل کر رکھ دیا جائے اس لیے کہ مودی ہے تو ممکن ہے۔ کشمیر کو کانگریس نے بڑی چالاکی سے عالمی منظر نامہ سے ہٹا کر ہند و پاک کا باہمی مسئلہ بنا دیا تھا اور ہر بین الاقوامی پر اس کو زیر بحث آنے سے روک دیا جاتا تھا لیکن مرکزی سرکار کی ایک حماقت نے اپنے پہلے 100 دنوں میں اسے سلگتا ہوا عالمی مسئلہ بنا دیا ہے۔

اقوام متحدہ میں انسانی حقوق کی کونسل کے 42ویں عالمی سیشن میں کشمیر پر اظہار خیال کرتے ہوئے ہائی کمشنر میچیل بیچیلیٹ نے حکومت کے 100 دن مکمل ہونے پر کہا کہ ’’میں نے ہندوستان سے مطالبہ کیا ہے کہ (کشمیر میں) موجودہ لاک ڈاؤن اور کرفیو میں نرمی لائی جائے تاکہ عوام کو بنیادی سہولتیں مل سکیں۔ حکومت ہند کے حالیہ اقدامات سے کشمیریوں کے انسانی حقوق متاثر ہوئے ہیں اس پر مجھے شدید تشویش ہے۔ انٹرنیٹ، مواصلاتی نظام اور لوگوں کے پر امن طریقے سے اکٹھے ہونے پر پابندی عائد ہے اور مقامی سیاسی رہنماؤں اور کارکنوں کی گرفتاریاں ہوئی ہیں۔‘‘ یہ بیان ایک ایسے وقت میں سامنے آیا جب وزیر اعظم کے بین الاقوامی دورے سے لوٹنے پر دعویٰ کیا جا رہا تھا کہ مسئلہ کشمیر پر ساری دنیا ہندوستان کے ساتھ ہے۔ اقوام متحدہ میں انسانی حقوق کی ہائی کمشنر نے کشمیر میں زیر حراست لوگوں کو اپنے دفاع کا حق دینے کا مطالبہ کرنے کے بعد یہاں تک کہہ دیا کہ ’’ایسی فیصلہ سازی میں کشمیری عوام کی رائے لینا اہم ہے کہ جس سے ان کا مستقبل جڑا ہو۔‘‘ یہ بیان تو امورِ خارجہ کے میدان میں بھی سرکاری ناکامی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

ریاست آسام میں 19 لاکھ لوگوں کی شہریت کی معطلی پر ہائی کمشنر برائے انسانی حقوق میچل بیچیلیٹ نے حکومت ہند سے مطالبہ کیا کہ ان لوگوں کو قید یا جلاوطن نہ کیا جائے اور ان کے لیے باقاعدہ لائحہ عمل تیار کیا جائے تاکہ وہ شہریت کی محرومی سے بچ سکیں۔ اقوام متحدہ میں جس دن یہ بیان دیا گیا اسی روز وزیر داخلہ امیت شاہ نے آسام میں اعلان کیا کہ کسی درانداز کو بخشا نہیں جائے گا۔ ان سب کو نکال باہر کرنے کے لیے ملک بھر میں این آر سی نافذ کیا جائے گا۔ یہ اس حکومت کا پہلے 100 دنوں میں سب سے بڑا انتظامی کارنامہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سنگھ پریوار اور ریاستی حکومت بھی این آر سی کی حتمی فہرست سے مطمئن نہیں ہے۔ جن 19 لاکھ لوگوں کی شہریت پر اقوام متحدہ میں تشویش کا اظہار کیا گیا ان میں سے 13 لاکھ ہندو ہیں۔ اس میں سے 11 لاکھ بنگالی اور 02 لاکھ دیگر زبانیں بولنے والے افراد ہیں۔ ممتا بنرجی کے مطابق ان میں سے ایک لاکھ گورکھا ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا امیت شاہ جی آسام کے خلفشار کو سارے ملک میں پھیلا کر عوام کو پریشان کرنا چاہتے ہیں؟ آسام کی 03 کروڑ آبادی کی این آر سی پر سولہ سو کروڑ سرکاری روپئے خرچ ہو گئے۔ عوام کے خرچ ہوئے اس پیسے کا کوئی حساب نہیں اب ملک کے ایک سو تیس کروڑ باشندوں پر کتنا خرچ ہوگا اور اس کا کیا نتیجہ نکلے گا؟

کشمیر کا فیصلہ اگست کے اوائل میں ہوا اور آسام کا معاملہ اواخر میں، اور درمیان میں یوم آزادی کے دن وزیر اعظم نے قوم سے خطاب کیا۔ اس موقع پر مودی جی نے ملک کے باشندوں کو پانچ ٹریلین ڈالر کی اکونومی کا خواب بیچنے کی کوشش کی۔ یہ خواب ایک ایسی صبح کو فروخت ہو رہا تھا جب ہندوستانی روپیہ ڈالر کے مقابلے منہ کے بل گرا جا رہا تھا اور ہنوز وہ سلسلہ جاری ہے۔ پانچ ٹریلین ڈالر کی معیشت بننے کے لیے قومی پیداوار کی شرح (جی ڈی پی) میں کم از کم 08 فیصد کا اضافہ لازم ہے۔ پی ایم او کے اقتصادی مشیر اس کے سات سے کم ہونے کی پیشن گوئی کر رہے تھے لیکن جب اس سہ ماہی کے اعداد و شمار آئے تو مایوسیوں کا شکار ماہرین اقتصادیات بھی شرمندہ ہو گئے اس لیے کہ وہ صرف 05 فیصد تھے۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ پانچ ٹریلین ڈالر کی اکونومی کا سفر 05 جی ڈی پی کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ اسی کے ساتھ جب یہ دعویٰ کیا گیا کہ دفع تین سو ستّر کا ہٹانے کا جو کام ستّر سالوں میں نہیں ہو سکا وہ ستّر دنوں میں ہو گیا تو عالمی سطح پر ہندوستانی معیشت پانچویں مقام سے سرک کر ساتویں پر آ گئی۔ اس مشکل سے نکلنے کے لیے حکومت نے عوام کی توجہ چدمبرم کی جانب مرکوز کروا کر ریزرو بنک سے اپنے خرچ کے لیے ایک لاکھ 67 کروڑ روپے نکلوا لیے۔ اس طرح ان 100 دنوں میں حکومت نے سرکاری خزانہ پر ہاتھ صاف کرنے میں جو کامیابی حاصل کی ہے اس کے لیے وہ بجا طور پر ’مبارکباد‘ کی مستحق ہے!

**DR SALEEM KHAN**
Vice President
Idara-e-Adab-e-Islami Hind,
Author & Political Analyst, Mumbai
**Email:** drsalimkhan@gmail.com

# نیشنل لاء اسکولوں میں احساس اپنائیت کی نشوونما

سدھارتھ سونکر

چندروز قبل نیشنل لاء یونیورسٹی (NLU)، دہلی کے 41 دلت اور آدی واسی طلبہ نے ایک ای میل کے ذریعے ادارہ جاتی سطح پر ذات پات کی بنیاد پر تفریق کا شکار ہونے کی شکایت درج کرائی۔ کیمپس میں اساتذہ، انتظامیہ اور طلبہ کی جانب سے بے حسی (Apathy) مبینہ طور پر خودکشی کی کوششوں میں اضافے کا سبب بن رہی ہے۔

سال رواں کے اوائل میں نیشنل لاء اسکول آف انڈیا یونیورسٹی (NLSIU)، بنگلور کے کنشک بھارتی نامی ایک دلت طالب علم نے اپنے ہاسٹل کے کمرے کی چھت سے لگے پنکھے پر لٹک کر اپنے آپ کو پھانسی دے دی تھی۔ پہلے سال میں کنشک کا تعلیمی مظاہرہ بہت اچھا تھا۔ البتہ دوسرے سال میں اس کی دماغی حالت خراب سے خراب تر ہونی شروع ہوگئی۔ مبینہ طور پر وہ ایک پرچے میں محض دو نمبرات سے ناکام ہوجانے کی وجہ سے اداس تھا۔ جب اعانتی نمبرات (Grace Marks) دینے کے لیے اس نے انتظامیہ کو لکھا تو اس کی گزارش کو مسترد کردیا گیا۔ شیزوفرینیا (ایک ذہنی عارضہ جس میں مریض کی شخصیت بے ربط اور منتشر ہوجاتی ہے) اور ذہنی دباؤ دونوں کا شکار ہوکر کنشک نے 16 مارچ کو خودکشی کرلی۔

بڑی تعداد میں طلبہ کی خودکشی کے واقعات کے پیش نظر ادارہ جاتی سطح پر بے حسی مطالعہ کرنا ناگزیر ہوجاتا ہے۔

## بے حسی کے عام کلچر سے متعلق

کنشک کی لاش اس کی موت کے تقریباً دو دن کے بعد ہی برآمد ہوسکی تھی۔ یہ اسے تنہا نہ رہنے دینے کی ذمہ داری کے حوالے سے ادارے کی ناکامی کی دلیل تھی۔ اس کی موت نیشنل لاء یونیورسٹیز میں ایک بحران کو نمایاں کرتی ہے۔ تعلیمی ادارے، بہت تیزی سے طلبہ کے لیے بوجھ کی مانند بنتے جارہے ہیں۔ کوالیفائے کرنے کے لیے کم ازکم نمبرات یا لازمی حاضری جیسے ضابطوں کا نفاذ طلبہ کے مختلف احوال وکوائف کو خاطر میں لائے بغیر کیا جارہا ہے۔

اس قسم کے ضابطے حاشیہ بردار طلبہ کو غیر موزوں طور پر متاثر کرتے ہیں، اور اکثر ان کی تحقیر پر منتج ہوتے ہیں۔ صعوبت سے بھرپور مسابقتی ماحول کی وجہ سے صورت حال میں مزید شدت پیدا ہوجاتی ہے۔ اس پر مستزاد، غیر معمولی تنخواہ ادا کرنے والی لاء فرمس (Law Firms) میں نوکری حاصل کرنے کی کوششوں کا دباؤ، جو ان کے اپنے طبقے کی جانب سے ہوتا ہے، طلبہ کو 'پناہ' حاصل کرنے کے لیے ہاسٹل سے باہر نکلنے پر مجبور کرتا ہے۔

اشرافیہ (elite) اداروں کا اجتماعی ماحول جہاں پہلے سے ہی ایک اخراجی ماحول موجود ہے، کیمپس کے اندر سماجی وابستگی (Social

(Cohesiveness) کو کمزور کرنے کا رویہ رکھتا ہے، طلبہ کو اپنے (مخصوص) سماجی حلقوں سے پرے اٹھ کر دیگر طلبہ کے ساتھ اپنائیت کا اظہار کرنے سے روکتا ہے۔ یہ رویہ کیمپس میں دلت طلبہ، جو اِلیٹ اداروں میں ہنوز تہہ بہ تہہ اخراجی رویوں کا شکار ہیں، کے لیے ان کی زندگی کو بہت دشوار بنا دیتا ہے۔ مثلاً انہیں اصل دھارے میں قبول نہیں کیا جاتا، کلاس روم میں ایسا مخصوص طرز تدریس اختیار کیا جاتا ہے جس میں طلبہ کی شمولیت کے جمہوری کرن کی کوشش کا فقدان ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر NLSUI کے ایک دلت سابق طالب علم کی شہادت بعنوان 'Roll Call of Shame' کو لے لیں۔ اس طالب علم نے درج فہرست ذات (SC) اور درج فہرست قبائل (ST) کے طلبہ کو ایک علاحدہ زمرے میں رکھے جانے کے لیے ایک دن میں چار مرتبہ کی جانے والی روزانہ کے رول کال کی سخت مذمت کی ہے۔ رول کال یہ ایک روزانہ کی مشق تھی، اور اس اسکول میں صلاحیت (Merit) جانچنے کا ایک پیمانہ تھی۔ حتیٰ کہ اسے طلبہ کی تعلیمی کارکردگی کی جانچ (Evaluation) کے وقت بھی ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ 2010ء تک وہاں 'Blind Marking' (کسی طالب علم کی شناخت کے بغیر اسے نمبرات دینا) کا نظام نہیں تھا۔ یہ ادارہ جاتی تعصّبات تعلیمی اداروں میں موجود بے حسی کے ایک عام کلچر کا پتہ دیتے ہیں، جو اس لیے موجود ہیں تاکہ محض اشرافیہ طلبہ ترقی کر سکیں اور حاشیہ بردار طلبہ پسماندہ ہی رہیں۔

## کان (Cahn) کا نظریہ اپنائیت

پروفیسر اپیتا دھاندا نے اپنے ایک حالیہ محاضرے میں یہ پیش کش کی کہ ایڈمانڈ کان (Edmond Cahn) کے نظریہ اپنائیت (Theory of Empathy) سے استفادہ کرتے ہوئے سماجی اخراج کے مسئلے کو حل کرنا لیگل ایجوکیشن میں اصلاحات کی جانب ایک قدم ہوگا۔

کان کے نظریہ کے مطابق انسان اپنے اندر ناانصافی کو محسوس کرنے کا ایک فطری داعیہ رکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہر انسان کے اندر یہ جذبہ موجود ہوتا ہے کہ کسی دوسرے پر ہونے والے حملے کو وہ اس طور پر لے کہ جیسے وہ حملہ خود اسی پر ہوا ہے۔ کان کے خیال میں انسان ایسا اس لیے کرتا ہے کہ اس کے اندر پہلے سے ودیعت کردہ ایک احساس اپنائیت موجود ہے۔ ایک شخص کی جگہ پر دوسرے شخص کو تصور کرنے کا یہ جذبہ اپنائیت، کان کے مطابق دراصل ناانصافی کی تحدید کی بنیاد ہے۔ یہ ہمیں یہ تصور کرنے میں مدد بہم پہنچاتا ہے کہ گویا ہم خود ہی ناانصافی کا شکار ہوئے ہیں۔ اس طور پر ہم نظر انداز کردیے گئے بیانیوں، گم کردہ اسباب اور اخراجی رویوں کو بہتر طور پر سمجھنے کے قابل ہوتے ہیں۔

کاہن کا کہنا ہے کہ بجائے اس کے کہ ہم سہل طور پر یہ سمجھیں کہ انصاف کے کیا کیا فوائد ہوسکتے ہیں، ضرورت ہے کہ ہم ناانصافی کو محسوس کریں۔ گو کہ ان میں سے اول الذکر کا تعلق اپنی اصل کے اعتبار سے، اس سے ہے جسے فطری قانونی روایات میں مثالی باور کیا گیا ہے، تاہم ناانصافی کا احساس انسانی جذبے کے جوش و حرارت احاطہ کرلیتا ہے۔ بقول کان، اس کے نظریے میں دو خصوصیات یکجا ہیں؛ اس کا نظریہ معقول بھی ہے، اور جذباتی بھی۔ اس بات کے اعتراف کے ساتھ کہ جذبات بِرضرورت سے فاضل زور ایک خطرناک راستے کی راہ ہموار کرسکتا ہے، کان معقولیت اور جذبات کے امتزاج کا قائل ہے۔ الغرض جذبہ اپنائیت میں ہمیشہ معقولیت کا عنصر بھی لازماً شامل ہونا چاہیے۔

یہاں یہ نوٹ کرنا اہم ہے کہ کان کا نظریہ اپنائیت اخلاقیات کا ایک مخصوص تصور نہیں تھوپنا چاہتا۔ کان کا ناانصافی پر زور دینا دراصل اس وجہ سے اہم ہے کہ یہ تصور ہائے اقدار پر اختلاف رائے کے باوجود ناانصافی کے خاتمے کی ایک مشترک بنیاد فراہم کرتا ہے۔ وہ اعتراف کرتا ہے کہ اپنائیت کے اظہار کا صحیح طریقہ عمل کیا ہو، اس پر ایک عاقل شخص اختلاف رائے رکھ سکتا ہے۔

فروغ اپنائیت یا احساس اپنائیت کی تخم ریزی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کسی شخص کو اس کے حق اختیار سے ہی محروم کردیا جائے۔ بلکہ اِس میں اُس پروسیس پر اثر انداز ہونا شامل ہے جس کے ذریعے ہم انتخاب کرتے ہیں۔ اور وہ پروسیس جانچ (Evaluation) اور رائے زنی (Judgement) کو وقتی طور پر معطل کرنے اور محض دوسرے فرد کے تجربات سے واقفیت حاصل کرنے سے عبارت ہے۔

پروفیسر دھاندا کے افکار کو بنیاد بناتے ہوئے، میں یہ مشورہ دیتا ہوں کہ نیشنل لاء یونیورسٹیز کو چاہیے کہ وہ طلبہ، اساتذہ اور انتظامیہ کی تربیت کرتے ہوئے ان کے اندر ناانصافی کا شکار ہوئے طبقات کے تئیں جذبہ اپنائیت پیدا کریں۔ اس عمل میں اپنائیت کے ساتھ، عقلیت کا بھی امتزاج ہوگا۔ نیز یہ لاء اسکولوں کے جمہوری کرن میں معاون ثابت ہوسکتا ہے۔

## احساس اپنائیت کی نشوونما

نیشنل لاء یونیورسٹیز احساس اپنائیت کی تخم ریزی کیوں کریں؟ سماجی انصاف کے حصول کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے طلبہ کے اندر کوئی قابل ذکر دلچسپی پیدا کرنے میں ناکامی پر یہ یونیورسٹیاں اچھی خاصی تنقیدیں وصول کر چکی ہیں۔ ایسا اس وجہ سے ہوا ہے کہ اکثر طلبہ لاء فرمس میں کریئر کے بھوت کا شکار ہوجاتے ہیں یا ان کے اندر سماجی انصاف کے حوالے سے سرے سے کسی دلچسپی ہی کو ختم کردیا گیا ہے۔ یہ ان کے اس مقصد کے متضاد ہے جس کے تحت انہیں پیدا کیا گیا ہے۔ ناانصافی کے تئیں بے حسی کے مسئلے میں اشرافیہ کی تشکیل کے ذریعے اضافہ ہوتا جاتا ہے، جیسا کہ NLSIU کے طلبہ کی جانب سے گئی ایک تحقیق سے عیاں ہوتا ہے۔

قانون کے زیادہ تر پروفیسر طلبہ کو تیز اور شاطر بنانے کے لیے انہیں یہ پڑھاتے ہیں کہ کیسے ایک وکیل کی طرح سوچا جائے، وہ شاذ و نادر ہی انہیں یہ پڑھاتے ہیں کہ کیسے 'محسوس' کیا جائے۔ پروفیسر طلبہ میں حق شناسی، باضمیری اور تنقیدی سوچ جیسی اقدار کو فروغ دیں، اس پر ان کی تشجیع نہیں کی گئی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ معاصر اساتذہ ناانصافی کا شکار طلبہ کے تئیں احساس اپنائیت پیدا کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے، باوجود اس کے کہ یہ سماجی انضمام کے لیے ناگزیر ہے۔

مثال کے طور پر لینڈ ایکویزیشن قانون کے جامد حروف کا خشک معنی سمجھنا اور بات ہے، جب کہ سَلَم بستیوں کے باشندوں کا، جو بار بار سرکاری مقاصد کے نام پر نقل مکانی پر مجبور ہوتے ہیں، ان کے عملی تجربات کا مشاہدہ کرنا ایک بالکل مختلف بات ہے۔ مؤخر الذکر میں، فرمانروائی کے لیے طاقت وقوت کو اپنے قبضے میں لینے کے بجائے اپنے آپ کو اس قانون سے متعلق مظلوموں کی جگہ پر کھڑا کرنا پڑتا ہے۔ گو کہ تمام لاء اسکولوں کے چند کورسز میں اپنائیت کی مشق کرانے کی کوشش کی گئی ہے، تاہم اکثر کورسز ہنوز فن تدریس کی سطح تک اس سے بالکل غیر متعلق ہیں۔

طلبہ ناانصافی کا احساس کیسے پیدا کر سکتے ہیں؟ ساتھی طلبہ کی جانب سے محسوس کی گئی ناانصافی کا تجربہ اپنے معمول کی نظروں سے پرے دیکھتے ہوئے تعلقات میں تنوع پیدا کر کے کیا جا سکتا ہے۔ ان سماجی حلقوں سے پرے جس میں محصور ہو کر ہم گفتگو کرتے ہیں، ان گروہوں سے گفتگو کر کے جن سے ہم بالعموم گفتگو نہیں کرتے، یا ان طبقات سے تعلقات استوار کر کے جن سے عام طور پر ہم اپنے سماجی تعصّبات کی بنا پر کوئی لین دین نہیں رکھتے۔

اس کی متعدد شکلیں ہو سکتی ہیں۔ ان طلبہ سے گفتگو کرنا جو ہو سکتا ہے کہ کسی کورس کو مشکل سمجھتے ہوں۔ جھونپڑی اور جھگیوں میں مقیم افراد سے ملاقات کرنا اور ان کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرنا، جنہیں اکثر کوئی دوسری جگہ فراہم کیے بغیر نقل مکانی پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ سینئر طلبہ جونیئر طلبہ کے مربی و نگراں کے طور پر بھی سرگرم عمل رہ سکتے ہیں۔

انتظامیہ میں احساس اپنائیت، اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے پیدا کیا جا سکتا ہے کہ حاشیہ بردار طلبہ اور ان سے وابستہ مسائل خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔ طلبہ کے غیر معمولی احوال ظروف کو اضافی احساس اپنائیت کے ساتھ ڈیل کیا جا سکتا ہے۔ اگر طلبہ کی ایک معتد بہ تعداد دلچسپی رکھتی ہو تو ایسے طلبہ کے لیے جو معمول کے محاضرات میں موضوعات کو سمجھنے میں دشواری کا سامنا کرتے ہوں، ادارے اضافی محاضرات کا نظم کر سکتے ہیں۔ چوں کے مکالمہ و گفتگو احساس اپنائیت کو بیدار کرنے کے ذرائع میں سے ہیں، دوران محاضرات طلبہ کو علاقائی زبانوں میں اظہار خیال کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ اس کے ذریعے شاید موضوعات کو مزید بہتر طریقے سے سمجھنے میں مدد ملے۔

ادارہ جاتی سطح پر احساس اپنائیت کی نشو و نما میں پروفیسر صاحبان بھی اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ وہ ایسا نصاب تیار کر سکتے ہیں جس میں ناانصافی کا شکار افراد کے عملی تجربات کی پڑھائی شامل ہو۔ مختلف کورسز کو باہمی طور پر ہم آہنگ بنانے کی مستقل کوشش کے ذریعے یہ مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ تدریس میں اپنائیت کا ادراک ایلنی دامیانیدو (Eleni Damianidou) اور ہیلین پتیا کا (Helen Phatiaka) کے پیش کردہ تین-مراحل پر مبنی ایک طریقے کے ذریعے کیا جا سکتا ہے۔ ان تین مرحلوں میں باضابطہ سماعت، طالب علم-معلم کے مابین مکالمہ اور احساس ہمدردی کو صیقل کرنے کے لیے کرداروں کا تبادلہ، شامل ہے۔

پہلے مرحلے میں طلبہ کے مختلف نقطہ ہائے نظر کو سمجھنا، اور ان کے عملی تجربات کی بنیاد پر نمبرات دینا شامل ہے۔ ایک مرتبہ طلبہ بے تکلف ہو جائیں، بات چیت کے تمام حجابات اٹھ جائیں، اساتذہ طلبہ کے دلوں میں گھر کر لیں، دوسرے مرحلے میں طلبہ کے تجربات سے متعلق وسائل مہیا کر دیے جائیں اور طلبہ کو ان مسائل پر بات چیت کرنے پر ابھارا جائے جن پر وہ اب تک خاموش رہتے تھے۔ بالآخر طلبہ، از خود حاصل کردہ علم کو ایک وسیع تر حلقے تک مشتہر کرنے لگیں گے۔ اور اس طرح ایک زیادہ معلومات رکھنے والا، جمہوری، تنقیدی اور اپنائیت رکھنے والا سماج وجود میں آ سکے گا۔ موجودہ اکیڈمک نصاب میں ایسی سرگرمیوں کو شامل کرنا جو دوسروں کی عینک سے دیکھنے میں مدد کرتی ہیں، بھی مددگار ہوگا۔ یہ اقدامات تعلیمی اداروں کو مزید انصاف پر مبنی بنا سکتے ہیں۔

یہ واضح کر دینا بھی اہم ہے کہ کان کا ماننا تھا کہ ناانصافی کا احساس عمل میں منتقل ہونا چاہیے۔ یعنی جو غلط ہے اس کی اصلاح کا عزم پیدا ہونا چاہیے۔ ناانصافی کے احساس کا پہلا مرحلہ جیسے ہی حاصل ہو جاتا ہے، دوسرا مرحلہ ناانصافی کا جواب دینے کے لیے ہمت یکجا کرنے کا ہوتا ہے۔ کان کے نظریہ اپنائیت کی طرح امرتیہ سین بھی 'نری ہمدردی' کی نفی کرتے ہوئے اسے عہد بستگی (Commitment) سے تعبیر کرتے ہیں۔

احساس اپنائیت کا تعلق اگر اپنے آپ کو محفوظ رکھتے ہوئے کسی دوسرے کی بہتری کے جذبات سے ہے، تو عہد بستگی قربانیاں دینے اور اعلی معیار زندگی کے امکان کے باوجود کم تر معیار زندگی پر قانع رہنے پر دلالت کرتی ہے۔ الغرض ناانصافی کا احساس عہد بستگی کی راہ ہموار کرتا ہے۔

(یہ مقالہ پہلے دی وائر، انگریزی میں شائع ہوا۔ مصنف کی اجازت سے رفیق منزل کے لیے ترجمہ کیا گیا۔ ادارہ)

**SIDDARTH SONKAR**
Final Year Student
at National University of Judicial Sciences
KOLKATA

# تصورِ حسن

نجم السحر

حسن، خوبصورتی اور عنائی ایسی صفات ہیں جو انسان کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ ان کی کشش انسانوں کو مسحور کرتی ہے۔ خوبصورتی جس شئے میں بھی ہو، اسے نکھار عطا کرتی ہے۔ اللہ نے انسان کی فطرت کچھ ایسی بنائی کہ انسان جمال کو پسند کرتا ہے۔ اس نے خود انسان کو بھی جمال سے بھرپور بنایا، اور حسن و جمال کی تعریف و تحسین کا انسان کو ذوق اور صلاحیت بھی دی۔

خوبصورتی ایک ایسی صفت ہے جسے کسی ایک دائرے میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ کی بنائی ہوئی کائنات کی ہر شئے خوبصورت ہے۔ طلوع سحر میں، غروب آفتاب میں، ماہتاب کی تابانی میں اور جگمگ جگمگ ستاروں میں، بادصرصر میں، نسیم سحر میں، درختوں کی بل کھاتی شاخوں اور کھیتوں میں لہلہاتی فصلوں میں، گلوں کی نکہت میں اور گیلی مٹی کی بھینی خوشبو میں، ہر جگہ جمال، حسن اور خوبصورتی ہی کی جلوہ آرائی ہے۔

خوبصورتی کی یہ جلوہ آرائی محض دلکش مناظر ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ اللہ کی تخلیق کردہ ہر جاندار مخلوق میں اس کا اہتمام موجود ہے۔ آسمان کی وسعتوں میں محو پرواز خوش رنگ پرندے، سمندر کی گہرائیوں میں غوطہ زن انواع واقسام کے آبی جاندار سب حسن و جمال سے بھرپور ہیں۔ جب دوسری مخلوقات کا معاملہ یہ ہے تو ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے کہ اللہ کی پیدا کردہ سب سے بہتر مخلوق، اشرف المخلوقات، انسان کو اللہ تعالی نے خوبصورت نہ بنایا ہو! بلاشبہ اللہ تعالی نے انسان کو بھی خوبصورت بنایا ہے، ہر انسان کو خوبصورت بنایا ہے، بہت خوبصورت! قرآن مجید میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

” هُوَالَّذِی یُصَوِّرُکُم فِی الْاَرْحَامِ کَیفَ یَشَاءُ ۔۔۔الخ“ (سورہ آل عمران، آیت 06، ترجمہ: وہی ہے جو تمہاری صورت گری کرتا ہے رحموں کے اندر جس طرح چاہتا ہے۔)

ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالی ارشاد فرماتے ہیں:

”خَلَقَ السَّماوَاتِ وَالاَرْضَ بِالحَقِّ وَ صَوَّرَکُم فَاَحْسَنَ صُوَرَکُم ۔۔۔الخ“ (سورہ تغابن، آیت 03، ترجمہ: اس نے آسمانوں اور زمین کو غایت کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اس نے تمہاری صورت گری کی تو اس نے تمہاری صورتیں اچھی بنائیں۔)

وہ مخلوق جس کی صورت گری خود اللہ نے کی ہو، اور جس کی خوبصورتی کی تعریف خود اللہ نے کی ہو، اس کے خوبصورت اور حسین ہونے میں کیا کسی شک وشبہ کی گنجائش ہے؟

حسن کا مطالعہ نظریاتی وفلسفیانہ سطح پر کیا جائے تو یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ حسن کے دو رخ یا دو پہلو ہوتے ہیں؛ ایک ظاہری، دوسرا

داخلی و باطنی۔ظاہری حسن کبھی وہبی (اللہ تعالی کی جانب سے عطا کردہ) ہوتا ہےاور کبھی کسبی (انسانی کوششوں سے حاصل کردہ)۔جب کہ باطنی یا داخلی حسن ہمیشہ کسبی ہوتا ہے۔ظاہری حسن عارضی و فانی ہوتا ہے، جب کہ داخلی حسن دائمی اور لافنا ہوتا ہے۔پھر یہیں سے یہ حقیقت بھی آشکار ہوتی ہے کہ انسان کے خوبصورت ہونے کا اصل دارومدار اس کے باطن کے حسین ہونے یا بدصورت ہونے پر ہوتا ہے۔جس انسان کا داخل و باطن حسین ہے، وہ انسان خوبصورت ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ ظاہری طور پر خوبصورت ہے یا نہیں۔اس کے برعکس جس انسان کا داخل و باطن مختلف قلبی برائیوں کی وجہ سے بدصورت ہے، وہ انسان دراصل بدصورت ہے، قطع نظر اس سے کہ اس کے ظاہری و باہری حسن کا کیا معاملہ ہے۔تاہم یہ موجودہ سماج، بشمول مسلمان، کی ستم ظریفی ہے کہ اس نے خوبصورتی کے معیار الٹ دیے ہیں۔ سب کی نگاہیں ظاہری حسن جمال ہی تک محدود ہوگئی ہیں۔اصل اور باطنی حسن و جمال کسی کے یہاں موضوع گفتگو نہیں ہے۔یہ بظاہر نا قابل محسوس مسئلہ معلوم ہوتا ہے، حالاں کہ اس وقت انسانی سماج کے سنگین مسائل میں سے ایک ہے۔کیوں کہ یہی وہ تصور ہے جو خاص طور پر نوجوان لڑکیوں کے ساتھ ظلم و ناانصافی کی راہ ہموار کر رہا ہے۔

انسان کے ظاہری حسن کے گلیمر سے آج کے انسان کی نگاہیں اس قدر خیرہ ہو چکی ہیں کہ جب کوئی نوجوان اپنے لیے یا اس کے اہل خانہ اس کے لیے شریک حیات کی تلاش میں نکلتے ہیں تو ان کا مطمح نظر یہی ہوتا ہے کہ لڑکی ان کے خودساختہ معیار حسن پر کھری اترے۔خدانہ خواستہ اگر لڑکی اس معیار پر پورا نہیں اترتی (واضح رہے کہ لڑکے والوں کا معیار حسن اس قدر مثالیت پسندی پر مبنی ہوتا ہے کہ بعض اوقات اس پر صرف جنت کی حوریں کھری اتر سکتی ہیں) تو پھر لڑکی کی رنگت اور نین ونقشہ سے لے کر اس کے قد وقامت تک پر ظالمانہ تبصرے شروع ہو جاتے ہیں۔حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”تُنْكَحُ الْمَرْأَةُ لِأَرْبَعٍ: لِمَالِهَا، وَلِحَسَبِهَا، وَلِجَمَالِهَا، وَلِدِينِهَا، فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّينِ تَرِبَتْ يَدَاكَ“ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 1466، ترجمہ: ایک عورت سے نکاح چار بنیادوں پر ہوتا ہے: اس کے مال کو دیکھ کر، اس کے خاندان کو دیکھ کر، اس کے جمال کو دیکھ کر، اور اس کی دینداری کو دیکھ کر، دیندار (عورت) کو پالو، تمہارے ہاتھوں کو خاک آلود کر دے گی۔)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان مبارک ہمیں دعوت غور فکر دیتا ہے کہ اس کی روشنی میں ہم اپنے آپ کا اور اپنے خاندان و اپنے سماج کا بے لاگ جائزہ لیں۔کیا جب ہم رشتہ تلاش کرتے ہیں تو ہمارے سامنے یہ معیار ہوتا ہے، جو معیار خود رسول اللہ نے بتایا ہے؟

حسب ونسب، مال ودولت اور شکل وصورت، یہ وہ خوبیاں ہیں جن کو حاصل کرنے میں انسان کا اپنا کوئی کمال نہیں ہے۔یہ تمام خوبیاں درحقیقت اللہ تعالی کی عطا کردہ ہیں۔جس کو چاہا، جتنا چاہا، عطا کر دیا۔اور جس کو چاہا محروم کر دیا۔یہ عطا کرنا اور محروم کرنا اس کے اس منصوبے کا حصہ ہے جس کے تحت وہ انسان کا امتحان لینا چاہتا ہے۔یہ خوبیاں ہمیشہ نہیں رہتیں۔جس کے پاس آج ہیں، ممکن ہے کل نہ ہوں۔جو آج محروم ہے، ممکن ہے کل مالا مال ہو جائے۔ان تمام کے برعکس دین داری وہ خوبی ہے جو انسان کی اپنی کمائی ہوتی ہے۔دینداری کے معاملے میں اللہ تعالی کی یہ سنت نہیں ہے کہ جسے چاہے دین دار بنا دے اور جسے چاہے دین سے بیزار کر دے۔نہیں، یہ تو انسان کی اپنی خواہش، عزم، ارادہ اور جدوجہد سے حاصل ہوتی ہے۔یہ وہ خوبی ہے جو تادم واپسیں، انسان کے ساتھ ساتھ رہ سکتی ہے۔بلکہ جتنا وقت گزرتا جاتا ہے، اس میں اضافہ اور بہتری آتی چلی جاتی ہے۔

حسن کردار اور حسن اخلاق کے زیور سے آراستہ، تعلیم یافتہ، دینی تعلیمات پر عمل پیرا، عصمت وعفت کی محافظ، صالح نوجوان لڑکیاں اگر انسان کے خودتراشیدہ تصور حسن کی بنیاد پر رجیکٹ کر دی جائیں، ان کی تمام داخلی و باطنی خوبیاں، اگر ان کی ظاہر خوبیوں کے سامنے ہیچ ثابت کر دی جائیں، تو یہ ایک لمحہ فکریہ ہے۔ایسی صورت حال میں سوچنے کی ضرورت ہے کہ ہم اور ہمارا سماج کس رخ پر جا چکا ہے!

انسان جب بھی کسی کام کو اپنی عقل، اپنی پسند و ناپسند اور اپنی نفسانی خواہشات کی روشنی میں انجام دیتا ہے، اور ایسا کرنے میں وہ شرعی حدود سے تجاوز کرتا ہے، تو وہ دیر یا سویر، لازماً فساد فی الارض کا مرتکب ہوتا ہے۔

ایک خاندان کی حیثیت سماج کی سب سے بنیادی اکائی کی ہوتی ہے۔ایک ایک خاندان کے ملنے ہی سے ایک سماج وجود پذیر ہوتا ہے۔اب اگر ہر خاندان میں تصور حسن کے لحاظ سے نقص پایا جائے گا، تو یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ ایسے خاندانوں سے مل کر وجود میں آنے والا سماج حسن کے تعلق سے کیا تصور رکھتا ہوگا۔چنانچہ حسن کے خودساختہ غلط تصورات کے برے نتائج اب سماج کے سامنے آنے لگے ہیں۔خود مسلم سماج اس کے برے نتائج بھگت رہا ہے۔ایسے رشتے وجود میں آ رہے ہیں جن کی بنیاد ظاہری حسن اور ظاہری چمک دمک ہے۔اس کی وجہ سے رشتوں میں مضبوطی نہیں پیدا ہو رہی ہے۔ظاہری چمک دمک میں فرق آتے ہی، رشتوں کے کچے دھاگے بھی دم توڑ جا رہے ہیں۔

**NAJUMS SAHAR**
Ph. D Scholar
Department of Urdu
Ranchi University
Email:anjumsahar9@gmail.com

# سورہ الانفال اور مطلوبہ صفات

صارم ایوبی

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو انسانوں کی ہدایت کے لیے نازل فرمایا۔ تاکہ انسان خدا کی ہدایات کی روشنی میں اپنی زندگی کی نوک و پلک درست کریں اور دنیا و آخرت دونوں میں کامیابی حاصل کریں۔ قرآن مجید کی سورہ الانفال کے ابتدائی حصہ میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی چند اہم صفات بیان کی ہیں۔ ان صفات کے بیان کی غرض یہ ہے کہ اہل ایمان ان صفات کو بطور نمونہ اختیار کریں اور ان کی زندگی ان ہی صفات کی آئینہ دار بن جائے۔ آیئے ہم سورہ الانفال میں وارد مومنین کی صفات میں سے چند اہم صفات کا جائزہ لیں:

اللہ تعالی نے سورۃ الانفال میں فرمایا "اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْھِمْ اٰیٰتُہٗ زَادَتْھُمْ اِیْمَانًا وَّعَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ۔ الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ۔ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَھُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَمَغْفِرَۃٌ وَّرِزْقٌ کَرِیْمٌ۔" (سورہ الانفال، آیت 02 تا 04، ترجمہ: "مومن تو وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل دہل جائیں اور جب اس کی آیتیں ان کو سنائی جائیں تو وہ ان کے ایمان میں اضافہ کریں اور وہ اپنے رب ہی پر بھروسہ رکھیں۔ جو نماز کا اہتمام کریں اور اس مال میں سے جو ہم نے ان کو بخشا ہے، خرچ کریں۔ یہی لوگ سچے مومن ہیں۔") ان آیات میں اللہ تعالی نے مومنوں کی پانچ اہم خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ ذیل میں ان صفات کی مختصر تشریح پیش کی جارہی ہے:

### پہلی صفت:

"مومن تو وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل دہل جائیں۔"

اس آیت میں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اللہ تعالی نے صفات کا ذکر اس صفت سے کیوں شروع کیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کا خوف اور اللہ کی خشیت ہر مومن کی بنیادی صفت ہوتی ہے۔ جب تک کسی مومن کے اندر یہ صفت پیدا نہیں ہو جاتی، حقیقی معنوں میں وہ مومن کہلانے کے لائق ہی نہیں ہے۔

قرآن مجید میں مومنین کی جتنی بھی صفات بیان کی گئی ہیں، ان تمام صفات پر صحابہ کرامؓ پورے اترتے تھے۔ جب کسی معاملے میں انہیں اللہ کی یاد دلائی جاتی تو وہ اللہ کے خوف سے کانپ اٹھتے تھے۔ ایک طرف تو وہ میدان جہاد میں دشمنوں پر شیر کی طرح حملہ آور ہوتے تھے، دوسری طرف جب اللہ کا ذکر ان کے سامنے ہوتا تو ان کے دل موم ہو جاتے۔ ایک بار ایک صحابی رسولؐ اپنے کسی غلام کو اس کی غلطی پر سزا دے رہے تھے۔ تبھی ادھر
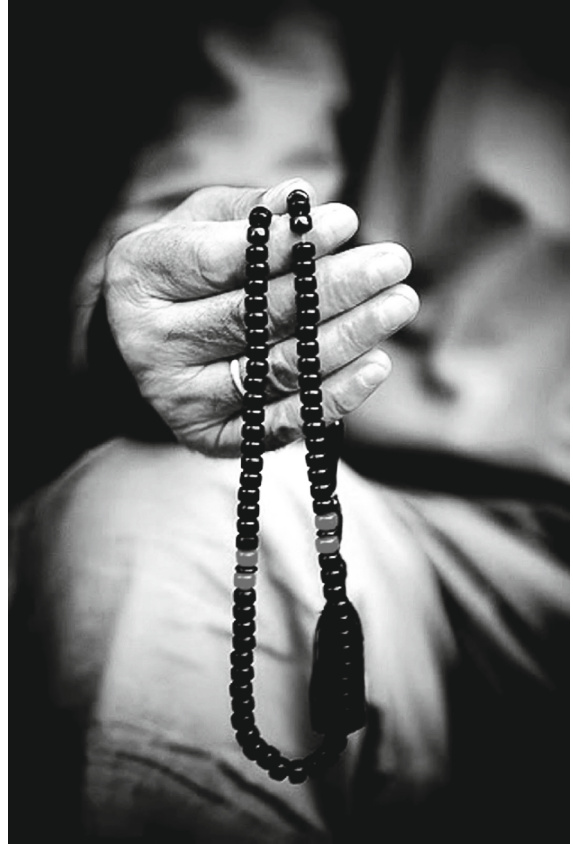
سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا اِتَّقِ اللّٰہ (اللہ سے ڈرو) اس غلام پر جتنی تم کو قدرت حاصل ہے اس سے کہیں زیادہ قدرت اللہ کو تم پر حاصل ہے۔ اتنا سننا تھا کہ صحابی رسول لرز اٹھے۔ انہوں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپ گواہ رہیے میں اس غلام کو اللہ کی راہ میں آزاد کرتا ہوں۔ اس واقعے سے اندازہ لگائیے کہ صحابہ کرامؓ کے دلوں میں اللہ کا خوف اور خشیت کس حد تک طاری تھی۔ یہ صرف ایک مثال ہے جسے ہم نے پیش کیا ہے ورنہ کتب سیرت اس طرح کے بے شمار واقعات سے بھری پڑی ہیں۔ اس آیت کا مطالعہ قاری کو اپنے احتساب پر ابھارتا ہے کہ وہ اپنا جائزہ لے اور دیکھے کہ جب اس کے سامنے اللہ کا نام لیا جاتا ہے تو آیا اس کا دل لرز اٹھتا ہے یا نہیں؟

## دوسری صفت:

''جب ان کے سامنے اللہ کی آیات پڑھ کر سنائی جاتیں ہیں تو ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔''

قرآن مجید اللہ تعالی کی طرف سے نازل کردہ ایک کلامی معجزہ ہے۔ اس کی ایک ایک آیت کی تاثیر، اس کی فصاحت و بلاغت کا عالم اس کے قاری سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس کی فصاحت و بلاغت سے ایک دنیا حیران و ششدر ہے۔ سچے مومنین کا معاملہ یہ ہے کہ جب ان کے سامنے اللہ کی آیات کی تلاوت کی جاتی ہے تو ان آیات کو سن کر ان کے ایمان و یقین میں تازگی پیدا ہوتی ہے۔ ان کا دل گواہی دیتا ہے کہ ہاں یہ واقعی اللہ کا کلام ہے۔ مومنین قرآن کی آیات میں اپنی پریشانیوں اور مصیبتوں کا حل پاتے ہیں۔ اور جب ان کے سامنے اللہ کی آیات کی تلاوت کی جاتی ہے تو ان کے ایمان میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ ان آیات میں جب جنت کی خوبصورت منظر کشی کی جاتی ہے تو مومن کے دل میں اس جنت کو حاصل کر لینے کی آرزو پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح جب جہنم کی وعید اور اس کی ہولناکیوں کا ذکر ہوتا ہے، تو مومنین اس سے بچنے کا تہیہ کرتے ہیں۔ جب رب العالمین کی ربوبیت کے جلوے بکھیرے جاتے ہیں تو مومن فرط محبت میں اپنے رب عظیم کی جانب بے ساختہ لپکتا ہے۔

صحابہ کرامؓ رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین جب قرآن کی آیات کی تلاوت کرتے تھے تو ان کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی تھیں اور ہچکیاں بندھ جاتی تھیں۔ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ جب قرآن کی تلاوت کرتے تو ان پر رقت طاری ہو جاتی۔ اور اس منظر کو دیکھنے کے لیے مکہ کے لوگ ان کے اردگرد جمع ہو جاتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے قبول اسلام کی وجہ قرآن کی آیات ہی بنیں۔ خلیفہ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ تعالی عنہ جب قرآن کی تلاوت کرتے تو اسی میں منہمک ہو جاتے۔ حتی کہ جس وقت انہیں شہید کیا گیا اس وقت بھی وہ قرآن کی تلاوت میں مشغول تھے۔ چنانچہ ہر قاری قرآن کو بھی اپنا جائزہ لینا چاہئے کہ جب وہ آیات قرآن کی تلاوت کرتا ہے یا جب اسے قرآن کی آیات سنائی دیتی ہیں تو اس کی کیفیت بھی ویسی ہوتی ہے یا نہیں جیسی کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین کی ہوا کرتی تھی؟ سورہ الفرقان میں اللہ تعالی نے مومنوں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمًّا وَعُمْيَانًا'' کہ ''یہ ایسے لوگ ہیں کہ جب انہیں ان کے رب کی آیات سنا کر نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اس پر اندھے اور بہرے بن کر نہیں رہ جاتے۔'' یعنی مومنین ایسے لوگ نہیں ہیں جو اللہ کی آیات سن کر ٹس سے مس نہ ہوں بلکہ وہ ان کا گہرا اثر قبول کرتے ہیں۔ جو ہدایات ان آیات میں آئی ہوئی ہیں وہ ان کی پیروی کرتے ہیں۔

## تیسری صفت:

''اور وہ اپنے رب ہی پر بھروسہ رکھتے ہیں۔''

مومنین کی تیسری خوبی یہ بیان کی گئی کہ وہ اپنے رب ہی پر توکل کرتے ہیں۔ اس مقام پر یہ بات غور کرنے کے لائق ہے کہ مفعول کو مقدم کیا گیا ہے اور فعل کو موخر۔ عربی زبان میں ایسا اس وقت کیا جاتا ہے جب کہ بات میں تاکید پیدا کرنا مقصود ہو۔ اسی بات کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہاں ایسا ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایسا نہیں ہے کہ مومنین اللہ پر بھی توکل کرتے ہیں اور دوسروں پر بھی بھروسہ رکھتے ہیں۔ نہیں، مومنین کے یہاں یہ دورنگی نہیں پائی جاتی۔ مومنین تو صرف اور صرف اللہ ہی پر توکل کرتے ہیں۔ چاہے ان پر بڑی سے بڑی مصیبت آن پڑے، وہ بہرحال اپنے رب ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں، اسی کی پناہ میں آتے ہیں، اور اسی پر توکل اور اعتماد کامل رکھتے ہیں۔ مومنین کا ایمان ہے کہ اگر اللہ رب العزت کسی کو فائدہ پہنچانا چاہے تو دنیا کی تمام طاقتیں مل کر بھی اسے نقصان نہیں پہنچا سکتیں مگر اتنا ہی جتنا اللہ نے لکھ دیا ہے۔ اور اگر اللہ تعالی کسی کو نقصان پہنچانا چاہیں تو دنیا کی تمام طاقتیں مل کر بھی اسے نفع نہیں پہنچا سکتیں مگر اتنا ہی جتنا اللہ نے لکھ دیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کا وہ مشہور واقعہ اسی بات کی دلیل ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ غار ثور کی پناہ میں تھے کہ اچانک مشرکین مکہ انہیں تلاش کرتے کرتے ان کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ حضرت ابوبکرؓ بالکل گھبرا گئے۔ انہوں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اگر یہ اپنے پیروں کو دیکھیں تو ہمیں دیکھ لیں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ اے ابوبکر! اللہ پر بھروسہ رکھو' ان دو آدمیوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے جن کا تیسرا اللہ ہوتا ہے؟'' تاریخ کی کتابوں میں ایسے بے شمار واقعات ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ صحابہ کرامؓ اور ان کے بعد تابعین اللہ پر کامل توکل کرتے تھے۔

### چوتھی صفت: ''جونماز قائم کرتے ہیں۔''

مومنین کی چوتھی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ نماز قائم کرتے ہیں۔ یہاں ہمیں لفظ اقامتِ صلاۃ پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ لفظ اقامت کے معنی ہیں سیدھا کرنا، درست کرنا۔ کوئی چیز گری ہوئی ہے اسے اٹھا دینا۔ یہاں نماز کے لیے لفظ اقامت کیوں استعمال کیا گیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں تک صرف نماز پڑھنے کی بات ہے، تو یہ تو منافقین بھی کرتے تھے۔ لیکن مومنین کا شیوہ یہ ہے کہ وہ نماز کو قائم کرتے ہیں۔ سماج میں نماز کا نظام بناتے ہیں۔ نمازوں کو ان کے صحیح اوقات میں ادا کرتے ہیں اور لوگوں کو نماز پڑھنے کی تاکید کرتے ہیں۔

نماز دین کی بنیاد ہے۔ اسلام لانے کے بعد سب سے پہلی عبادت نماز ہی ہوتی ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین جتنی اہمیت نماز کو دیتے تھے اتنی کسی دوسری چیز کو نہیں دیتے تھے۔ سیرت میں ایک غزوے کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ نبی ﷺ اور صحابہ کرامؓ ایک غزوے سے واپس ہو رہے تھے۔ چلتے چلتے رات ہوگئی تو ایک جگہ فوج کا پڑاؤ ہوا۔ جب فوج کے سونے کا وقت ہوا تو ان میں سے دو صحابیوں کو رات میں پہرا دینے کی ڈیوٹی سونپی گئی۔ ان دونوں حضرات نے آپس میں طے کرلیا کہ کچھ دیر آپ پہرہ دیں گے اور میں آرام کروں گا اور کچھ دیر میں پہرہ دوں گا اور آپ آرام کیجیے گا۔ چنانچہ ایک صحابیؓ پہرہ دینے لگے اور دوسرے آرام کرنے لگے۔ پہلے نے سوچا کہ یہ وقت جو مجھے ملا ہے اس میں کیوں نہ کچھ نفل نماز پڑھ لوں۔ وہ اسی نیت سے نماز پڑھنے لگے۔ اتنے میں دور سے کسی دشمن کی ان پر نظر پڑی۔ اس نے اپنے تیر کا نشانہ ان کی طرف کیا اور چھوڑ دیا۔ تیر سنسناتا ہوا ان کے سینے میں آلگا۔ لیکن صحابی رسول کا نماز میں انہماک اور شوق دیکھئے کہ انہوں نے نیت توڑنا گوارہ نہ کیا بلکہ نماز جاری رکھی۔ پھر دشمن کا دوسرا تیر ان کے سینے میں آلگا۔ تب تک ان کے ساتھی کی آنکھ کھل گئی اور انہوں نے جلدی سے ان کی جان بچائی اور دشمن کو قتل کیا۔ پھر انہوں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے مجھے کیوں نہ جگا دیا؟ انہوں نے کہا کہ میں نے نماز شروع کی تھی اور میں نے یہ گوارہ نہ کیا کہ نماز کو منقطع کروں۔ یہی وہ خوبیاں تھیں جس کی بنا پر اللہ نے انہیں دنیا و آخرت میں سربلندی عطا کی۔

### پانچویں صفت:

''اور ہم نے انہیں جو رزق دیا ہے اس میں سے وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔''

مومنین کی پانچویں صفت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ اس آیت کریمہ میں مذکورہ پچھلی چار خصوصیات حقوق اللہ سے متعلق ہیں۔ یعنی اللہ کے ذکر سے دلوں کا لرز اٹھنا، قرآن کی آیتوں کو سن کر ایمان میں اضافہ ہونا، توکل علی اللہ اور اقامت صلوٰۃ، یہ چاروں صفات حقوق اللہ سے متعلق ہیں۔ آخر میں جو صفت بیان ہوئی ہے وہ حقوق العباد سے متعلق ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ کی فضیلت قرآن میں متعدد مقامات پر بیان کی گئی ہے۔ یہاں تک کہ سورہ الحدید میں اسے اللہ کو قرض دینے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جس سے انفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ مومنین کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ اپنے مال میں غریبوں کا حق تسلیم کرتے ہیں۔ اگر وہ کسی غریب کو کچھ دیتے ہیں تو یہ سمجھ کر نہیں دیتے کہ ہم ان پر احسان کر رہے ہیں، بلکہ یہ سمجھ کر دیتے ہیں کہ اس مال میں ان کا بھی حق ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ کی فضیلت سورہ البقرہ کی آیت 261 میں بیان کی گئی ہے کہ کیسے انفاق کے ایک اجر کو بڑھا کر سات سو گنا کر دیا جاتا ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین انفاق فی سبیل اللہ کے سلسلے میں ایک دوسرے سے مقابلہ و مسابقت کرتے تھے۔ غزوہ تبوک میں راہ خدا میں مال لٹانے کا جذبہ دیکھیے کہ حضرت عمرؓ اپنے گھر کا آدھا سامان لے آئے ہیں اور اس بات پر مگن ہیں کہ نیکی کے معاملے میں آج میں سب پر سبقت لے گیا۔ دوسری طرف دیکھیے کہ حضرت ابوبکر سباقؓ اپنے گھر کا پورا سامان لے کر آگئے ہیں اور اسے خدا کے حوالے کر دیا ہے۔

ان تمام صفات کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے آخر میں فرمایا کہ ''أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ'' یعنی وہ مومنین جو ان صفات پر کھرے اترتے ہیں۔ جن کے دل اللہ کے خوف سے کانپ اٹھتے ہیں، جب وہ قرآن سنتے ہیں تو ان کے ایمان میں تازگی پیدا ہوتی ہے، وہ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور انفاق فی سبیل اللہ کرتے ہیں، وہی پکے اور سچے مومنین ہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان کا دعوی کرتے ہیں، لیکن اللہ کا ذکر سن کر نہ ان کے دل لرزتے ہیں، نہ اللہ کی آیات سن کر ان کی ایمانی کیفیت میں اضافہ ہوتا ہے، نہ وہ نماز کا سنجیدگی سے اہتمام کرتے ہیں، نہ اللہ کی راہ میں مال ہی خرچ کرتے ہیں، تو وہ اپنے ایمان کا از سر نو جائزہ لیں۔

**SARIM AYYUBI**
Jamiatul Falah
Azamgarh
Uttar Pardesh(UP)

بزم

# فتح مبین

خان عرشیہ شکیل

آپ ﷺ کی بعثت کا مقصد بت پرستی کو مٹا کر توحید کے علم کو بلند کرنا تھا۔ اس مشن کا آغاز سورہ مدثر کی ان آیات سے ہوا ''اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے، اٹھو خبر دار کرو اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو۔'' (آیات کا ترجمہ: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ)

مکی دور میں آپ نے 13 سال صبر و استقامت کے ساتھ دعوت کا فریضہ انجام دیا باطل کی ریشہ دوانیوں اور ظلم و ستم کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے بلکہ اللہ پر توکل کر کے صبر کے ساتھ اپنے پیغمبرانہ مشن کو انجام دیتے رہے۔ آپ نے تین سال خفیہ دعوت دی اس کے بعد آپ نے اعلانیہ دعوت دی۔ جس کی پاداش میں آپ اور آپ کے ساتھیوں کو سخت مشکل مراحل سے گزرنا پڑا۔ جس میں دو بہت سخت مرحلے بھی پیش آئے۔ پہلا مرحلہ، آپ ﷺ اور آپ کے ساتھی اور آپ کے خاندان کے وہ افراد جو آپ کا ساتھ دے رہے تھے انہیں، تین سال کے لیے شعب ابی طالب میں محصور کر دیا گیا۔ پوری طرح سماجی بائیکاٹ کیا گیا۔ نہ آپ لوگوں سے کوئی بات چیت کر سکتا تھا، نہ کوئی خرید و فروخت ہو سکتی تھی اور نہ شادی بیاہ ہو سکتا تھا۔ حتیٰ کہ جب شعب میں موجود غلہ ختم ہو گیا تو لوگوں کو شدت بھوک اور پیاس سے مجبور ہو کر درخت کے پتے اور چمڑے بھی چبانے پڑے۔ دوسرا مرحلہ، نبوت کے دسویں سال آپ دعوت کی غرض سے طائف تشریف لے گئے جہاں آپ ﷺ نے قبیلہ ثقیف کے تین سرداروں عبد یالیل، مسعود اور حبیب کو اسلام کی دعوت دی۔ انہوں نے آپ کی دعوت کو قبول نہ کیا بلکہ چند اوباش بچوں کے ذریعے آپ پر پتھر برسائے۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ کی جوتیاں خون سے بھر گئیں۔ پھر بھی آپ نے ان کے لئے خیر کی دعا کی۔ آپ کی سیرت کا انتہائی دور اندیش پڑاؤ مستقبل میں دعوت کی راہ میں معاون ثابت ہوا۔

بیعت عقبہ اولیٰ اور بیعت عقبہ ثانیہ میں مدینے کی بارہ سعید روحوں نے اسلام قبول کیا اور اپنے ساتھ اسلام کا پیغام مدینہ لے گئے۔ چنانچہ مدینہ میں گھر گھر آپ ﷺ کا چرچا ہو گیا۔ حضرت مصعب بن عمیرؓ اور حضرت اسعد بن زرارہؓ نے جوش و خروش سے اسلام کی تبلیغ کی۔ جس کے نتیجے میں مدینے میں انصار کا کوئی گھرانہ ایسا نہ بچا، جہاں کے مردوں اور عورتوں نے اسلام قبول نہ کیا ہو۔

دعوت کے کامیاب مرحلے کے بعد اللہ کے حکم سے آپ نے مکہ سے مدینہ ہجرت کی۔ آپ ﷺ نے سب سے پہلے مسجد قبا کی بنیاد رکھی۔ جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی تھی۔ اس کے بعد مسجد نبوی کی تاسیس عمل میں آئی۔ آپ نے قریش کو یہ پیغام دیا کہ اسلامی ریاست اور اسلامی نظام تمدن کا قیام انشاء اللہ جلد ہی شرمندہ تعبیر ہو گا۔ نظام حق کے نفاذ اور تحفظ کے لیے مومنین کمر بستہ ہو چکے تھے۔ چار بڑے معرکے پیش آئے۔ بدر، احد، خندق اور فتح مکہ ۔حق و باطل کی کشمکش کا فیصلہ کن معرکہ غزوہ مکہ آٹھ ہجری میں پیش آیا جس میں بارہ ہزار جاں فروش اصحاب رسول نے مارچ کیا۔ کچھ چھوٹی بڑی جھڑپوں کے بعد قریش نے ہتھیار ڈال دیے اور مکہ پر اسلامی فوج نے اپنا جھنڈا لہرایا۔ یہ غزوات کسی دنیاوی فائدے کے لیے نہیں پیش آئے تھے اور نہ نسلی غرور، قبائلی تعصب اور تجارتی مفادات ہی کے لیے، بلکہ یہ ایک نظریاتی اور اخلاقی جنگ تھی۔ دو طاقتوں کے مدمقابل آنے پر یہ واضح ہو گیا کہ یہ جنگیں انسانیت کی فلاح کے لیے لڑی گئی تھی۔ مکہ فتح ہونے کے بعد قریش سخت اندیشوں کا شکار تھے۔ ڈر رہے تھے کہ جن اہل اسلام کو ہم نے برسوں اذیت سے دو چار کیا ہے، اب وہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟ لیکن آپ ﷺ نے قریش کو مخاطب کر کے پوچھا کہ اے قریش کے لوگو! تمہارا کیا خیال ہے، میں تمہارے ساتھ کیسا سلوک کرنے والا ہوں؟ انہوں نے کہ آپ ہمارے ساتھ اچھا سلوک کرنے والے ہیں۔ آپ سراپا خیر و شرافت ہیں۔ ہم آپ سے خیر ہی کی توقع رکھتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا تو میں تم سے وہی بات کہہ رہا ہوں جو یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی کہ جاؤ تم سب آزاد ہو۔ اس کے بعد جوق در جوق لوگ آتے گئے اور اور ایمان قبول کرتے گئے۔ یہ واقعہ اور یہ سلوک دلیل ہے کہ آپ ﷺ نے ملکوں ہی کو فتح نہیں کیا بلکہ دلوں کو بھی فتح کیا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مومنین کی درج ذیل صفات بیان کرتے ہوئے اس کی تصدیق بھی کر دی ہے:

''یہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو سرزمین میں اقتدار بخشیں گے تو یہ نماز کا اہتمام کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے۔ معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے اور انجام کار کا معاملہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔'' (سورہ الحج، آیت 41، ترجمہ: مولانا امین احسن اصلاحیؒ)

سلام ہے محسن انسانیت ﷺ کی ذات اقدس پر کہ جس نے انسانیت کو معراج کی بلندیوں پر پہنچایا آپ کا اسوہ تاریکی میں پھنسی ساری دنیا کے لئے مشعل راہ ہے۔

محفل

# فطری طرز زندگی کی طرف واپسی

وکیش کمار بڈولا

انسانی زندگی اپنے ارتقائی سفر میں بے شمار تبدیلیوں سے گزری ہے۔ البتہ پچھلے پندرہ برسوں میں دنیا کے نقشے میں جو تبدیلیاں آئی ہیں وہ بہت الگ ہیں۔ 'تبدیلی' سے مراد انسان، خاندان، گاؤں، شہر، رشتے - ناطے، دوستی- یاری، تیج تیوہار منانے کے طور طریقے میں تبدیلی ہے۔ پچھلی ڈیڑھ دہائی میں انسانی زندگی اپنی اصل زندگی جیسی نہیں بچی ہے۔ جو کچھ ہے، جیسا بھی ہے سب 'رفتار' کے حوالے ہے۔ اس کے علاوہ انسان کو سانس لینے کی بھی فرصت نہیں۔ کسی سے پیار، اپناپن اور ہمدردی ملنے کی امید تو بے معنی سی لگتی ہے۔

ترقی کا یہ عالم ہے کہ زمین کے ایک کونے پر رہ رہے انسان کا دوسرے کونے پر بس رہے اس کے دوست یا رشتے دار سے رابطہ کرنا بہت آسان ہو گیا ہے۔ کیوں کہ اس کے پاس بے شمار وسائل موجود ہیں۔ جیسے موبائل فون، کمپیوٹر وغیرہ کے ذریعہ وہ سیکنڈوں میں سیدھے ان سے رابطہ کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے پاس پیسہ ہے۔ سارے عیش کے سامان مہیا ہیں۔ پھر بھی ایک بے چینی ہے۔ ایک عجیب کشمکش ہے۔ یہ سب ایک انسان کو دوسرے انسان سے رک کر بات نہیں کرنے دیتا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی لوگ ایسی اندھیری اور تنگ کوٹھری میں گھستے چلے جا رہے ہیں جہاں سے ایک آئیڈیل انسان کی شکل میں واپس آنا تقریباً ناممکن ہو چکا ہے۔ چاروں طرف ہم وہی ہوتا ہوا دیکھ رہے ہیں جو انسان کو نہیں کرنا چاہیے۔ اس کا غرور اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ وہ لازوال قدرتی علامات جیسے سورج، چاند، ستارے، زمین اور اس کے نباتات و جمادات کے تئیں بھی سنجیدہ نہیں ہے۔ انسان کے ہونے، سانس لینے کی جو چیزیں وجہ ہیں ان کے لیے اس کے مَن میں عزت واحترام بھی نہیں بچا ہے۔ جہاں انسان کی نصف زندگی ان قدرتی اجزا کی خوبصورتی، انوکھاپن اور موجودہ المیہ پر سوچتے ہوئے گزرنی چاہئے تھی وہاں وہ انتہائی ذلت کی زندگی گزارنے پر تلا ہوا ہے۔ اس صورت حال میں کون کہے گا کہ انسان ماڈرن ہو رہا ہے؟ کیا موڈرنٹی یہی ہے کہ طرح بے طرح کی چیزوں کا اصراف کر کے زمین کو پلاسٹک کے کوڑے کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا جائے؟ مناسب حل نہ مل پانے کی صورت میں اس ڈھیر کو آگ لگا دی جائے؟ اس کے بعد آگ سے اٹھنے والے بھاری، بدبودار دھوئیں میں انسانی زندگی کو گھٹتے ہوئے دیکھا جائے؟ لیکن ایسا دیکھا جا رہا ہے۔ انسانی زندگی کا سفر دشوار ہوتا جا رہا ہے۔

سطحی سیاست، مفاد پرست سیاست دانوں، رشوت خور افسروں اور کرم چاریوں اور بیوقوف لوگوں والے کسی دیس- سماج میں انسانی زندگی کا سفر بھلا ٹھیک چل بھی کیسے سکتا ہے۔ ایسے ماحول میں اچھا سوچنے والے اور اچھا کرنے والے ہیں ہی کتنے جن کے انسپریشن سے سب ٹھیک ہو جائے! جدھر دیکھو ادھر لالچی نظریں پسری ہوئی ہیں۔ کسی کو اطمینان اور امن نہیں چاہئے۔ سبھی کو بھاگنا دوڑنا ہے۔ یہاں سے وہاں، وہاں سے کہیں اور۔۔۔ آخری منزل کیا ہے، یہ جانے بغیر بس بھاگنا ہے۔ اس لئے سب بھاگے جا رہے ہیں۔

ایسے میں ہمیں خود کو دیکھنا ہوگا اور تجزیہ کرنا ہوگا۔ اپنی ذہنی صحت کے بارے میں سوچنا ہوگا کہ کیا ہم خطرناک قسم کے انتشار ذہنی اور ذہنی بے ترتیبی کا شکار تو نہیں ہوتے جا رہے ہیں؟ کئی بار ایسا لگتا ہے کے ہماری سوچنے کی طاقت ختم ہو گئی ہے۔ کچھ سوچنے سے پہلے ہی ہم غصے میں بولنے لگتے ہیں۔ کبھی ہمیں اپنا بولا ہوا یاد بھی نہیں رہتا۔ ہمارا روزمرہ کا شیڈول ہو گیا ہے کہ ہمیں غصے میں کچھ بولنا ہے۔

یہ سب اس لئے ہو رہا ہے کہ ہم نے اپنی فطری زندگی کو کونام نہاد اور بناوٹی ماڈرن رنگ میں رنگ لیا ہے۔ موبائل، موٹر سائیکل، ٹیلی ویژن کے بے کار ڈراموں سے خود کو چپکا لیا ہے۔ نئی اور ماڈرن زندگی کا غلط استعمال دو ملکوں کے درمیان نیوکلیائی جنگ ہونے اور اس کے بعد قدرتی آفات کے بے پناہ نقصان کی شکل میں تو بعد میں ہوگا، پر موبائل، موٹر سائیکل، ٹیلی ویژن، کمپیوٹر، انٹرنیٹ کے آگے خود کو غلام بنا دینے کی شکل میں یہ پچھلی ڈیڑھ دہائی سے بڑے خطرناک طریقے سے ہو رہا ہے۔

اب بھی وقت ہے۔ ایک حل ہے جس سے ہماری زندگی آسان، پرامن اور فطری طریقے پر بچی رہ سکتی ہے۔ ہمیں جدید وسائل اور سہولیات پر منحصر رہنے کی اپنی عادتوں کو بتدریج کم کرنا ہوگا۔ اس کے لیے ہماری رہنمائی ملک، قومی سیاست داں، سرمایہ دار، کاروباری ادارے، تعلیم گاہیں یا ہمارے بہت زیادہ آرزومند والدین نہیں کریں گے۔ یہ لوگ اس لیے رہنمائی نہیں کریں گے کیونکہ جدید وسائل اور سہولیات پر ہمارے منحصر رہنے میں ان کے معاشی اور معاشرتی مفاد وابستہ ہیں۔ اس لئے جو کرنا ہے ہمیں خود کرنا ہے۔ جن لوگوں کی مجبوری ہے انہیں تو رخصت دی جا سکتی ہے، لیکن جنہیں موبائل، موٹر سائیکل، ٹیلی ویژن، انٹرنیٹ وغیرہ سے زیادہ وابستگی کی ضرورت نہیں ہے وہ انہیں اپنے گلے کی پھانس کیوں کر بنائیں! ان سب چیزوں کا استعمال محدود ہو۔ جب ایسا ہوگا تبھی ہم اپنی اپنی زندگیوں کو نظام فطرت کے عین مطابق گزار سکیں گے اور ساتھ میں قدرتی وسائل کو بچانے میں بھی اپنا تعاون فراہم کر سکیں گے۔

(بشکریہ جن ستا ہندی)

# پدرانہ سماج کو آئینہ دکھانے کی کوشش

ڈاکٹر تسلیم عارف

ہم ہمیشہ سے سنتے آئے ہیں کہ اسلام نے خواتین کو چودہ سو سال پہلے وہ تمام حقوق فراہم کر دیے تھے جو موجودہ عہد میں خواتین کو دیے جا رہے ہیں یا جن کی مانگ اٹھ رہی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ برِصغیر کی حد تک مسلم سماج میں بھی مردوں کی بالادستی نے خواتین کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم رکھا۔ رفیقِ منزل کے اگست 2019ء کا شمارہ اس اعتبار سے لائق تحسین ہے ۔شمارے میں اس سمت بے حد غور وفکر کے ساتھ ایک ایسا گوشہ تیار کیا ہے جس میں موجودہ عہد کے اہم مسائل کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔

اس شمارے میں خاص طور پر چار مضامین کافی حد تک موجودہ سماجی نظام میں خواتین کے متعلق اہم مسائل کی طرف توجہ مبذول کراتے ہیں۔ 'عصر حاضر کے چیلنجز اور مسلم خواتین کی ترقی' (آمنہ تحسین)، 'سوشل میڈیا میں خواتین کی دعوتی وسماجی سرگرمی' (ناز آفرین)، 'سیکس کا بازاری کرن اور خواتین' (ڈاکٹر جاوید جمیل) اور 'خواتین کی ہراسانی، تشدد وعدم تحفّظ : کیا کوئی حل بھی ہے؟' (ریحان انصاری) ایسے مضامین ہیں جن کے لکھنے والوں نے واقعی ہمارے سماج کی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی ہے۔ ڈاکٹر آمنہ تحسین مختلف زاویوں سے مسلم خواتین کی ترقی کی مسدود راہوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ایک مناسب نکتے کی طرف پہنچی ہیں کہ ان کی ترقی اور پسماندگی سے نجات تبھی ممکن ہے جب 'مسلم معاشرے کی سوچ، فکر اور عمل میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوں' یعنی وہ صنفی تعصّبات اور ذہنی بندشوں سے خود کو آزاد کر کے مسلم خواتین کے لیے طویل مدتی تربیتی اقدامات کرے اور خود خواتین کو بھی اپنی تساہلی چھوڑ کر اس سلسلے میں اہم رول ادا کرنے کی ضرورت ہے۔ محترمہ ناز آفرین نے سوشل میڈیا کی اہمیت کے باعث یہاں مسلم خواتین کی دعوتی سرگرمیوں کا جائزہ لیا ہے۔ یہ بات مسلّم ہے کہ سوشل میڈیا ایک ایسی آگ ہے جس کے استعمال میں ذرا سی بھی لاپرواہی بڑے فتنے کا باعث بن سکتی ہے۔ لہٰذا یہ ضروری تھا کہ اس سلسلے سے بھی رہ نمائی فراہم کی جائے۔ اس میں انہوں نے سوشل میڈیا پر دعوتی سرگرمیوں سے متعلق چند ضروری ہدایات بھی تحریر کی ہیں اور چند ہم عصر خواتین کی دعوتی سرگرمیوں کی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ ان ہدایات سے نہ صرف خواتین بلکہ مرد بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں، یہ اس مضمون کا وصف ہے۔ ڈاکٹر جاوید جمیل نے بہت ہی نازک اور خطرناک مسئلہ اٹھایا ہے لیکن یہ موجودہ سماجی نظام کے تعلق سے نہایت اہم مسئلہ ہے۔ سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلوں نے سماج کو کس گہری کھائی میں دھکیلا ہے ہمیں اس کا اندازہ بھی ہے۔ عالمی تناظر میں صحیح معنوں میں عورت ایک جنسی آلہ تو تھی ہی اب ہندستان جیسا مذہب اور تہذیب کو اولیت دینے والا ملک بھی اس سے متاثر ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر جاوید جمیل نے بے حد نپے تلے انداز میں خواتین کی پوزیشن کو واضح کیا ہے کہ کس طرح انہیں آزادی اور عدمِ تحفظ کے نام پر اپنے دام میں پھنسایا جاتا ہے۔ وہ دن دور نہیں کہ ہندستانی سماج بھی خاندانی نظام کی تباہی کی طرف گامزن ہو جائے گا۔ مسلم معاشرے کو اس سے بچانے کی اشد ضرورت ہے اور اس سلسلے میں عملی اقدامات بھی لازمی ہیں۔ ڈاکٹر ریحان انصاری نے بھی ماضی سے لے کر اب تک خواتین پر ہونے والے ظلم وتشدد کا جائزہ لیتے ہوئے اسلام کے ذریعے فراہم کیے گئے حقوق بیان کیے ہیں۔ مضمون نگار نے خواتین کے تعلق سے سماجی ناانصافیوں کا ذکر کیا ہے لیکن مسئلے کے لیے اقدامات پر وہ وضاحت اور تفصیل سے کوئی بات کرتے نظر نہیں آتے۔ لیکن یہ کیا کم ہے کہ انہوں نے بڑی محنت سے مختلف بنیادی نکات فراہم کیے ہیں جس کی جڑیں خواتین پر ہونے والے ظلم وتشدد تک پہنچتی ہیں کیوں کہ اگر بیماری کی پہچان ہو جائے تو ضرور اس کے علاج تک رسائی ہو سکتی ہے۔

دیگر مضامین میں 'خواتین پر بڑھتے تشدد اور استحصال میں فلموں کا کردار' (عمر فراہی) اور 'حقوقِ نسواں کے نفاذ میں مسلم نوجوانوں کا رول (نوید السحر) بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ کوَر اسٹوری اس رسالے کے ضمیمے یا مقدمے کے طور پر دیکھی جا سکتی ہے جسے مدیر سعود فیروز نے تحریر کیا ہے۔ یہاں انہوں نے نہ صرف برسوں سے خواتین پر ہونے والے ظلم و استحصال کو ایڈریس کیا ہے بلکہ موجودہ عہد میں اس کی شاخوں کی بھی نشان دہی کی ہے۔ جناب سعود فیروز کی رائے بجا ہے کہ خواتین کے تعلق سے یہ ساری خرابیاں پدری سماج کی وجہ سے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ہمارے مسلم مقتداؤں نے بھی اس جانب توجہ نہیں کی۔ حقیقی بات یہی ہے کہ نصف آبادی کے معذور ومحروم رہنے سے کوئی بھی سماج ترقی اور بلندی حاصل نہیں کر سکتا۔ میں اس کے مختلف مضامین کی اہمیت کے باعث رسالے کی پوری ٹیم کو مبارک باد پیش کرنا چاہوں گا اور امید کروں گا کہ اس سلسلے سے وقفے وقفے سے ایسے گوشے اور خصوصی تحریریں بھی سامنے آئیں جس سے ہمیں اپنے زندہ رہنے کا احساس ہو اور تمام منفی کیفیات کے باوجود ہم یہ کہہ سکیں: یہ کذب وافترا ہے، جھوٹ ہے، دیکھو میں زندہ ہوں!

**DR TASLEEM ARIF**
Ass Prof. GLA College
Medininagar Jharkhand
tasleem171@gmail.com
7004846692